فصل سوم

حقوقِ نسواں کی تحریکیں

اس فصل میں ہم حقوقِ نسواں کی تحریکوں کا جائزہ لیں گے مگر اس سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے میں عورت کا اصل کام اور مقام کیا ہے۔ اس کے بعد مغرب میں عورت کی صورتِ حال اور تحریک آزادی وحقوق نسواں کا جائزہ بھی لیا جائے گا، اور آخر میں یہ بتایا جائے گا کہ مشرق میں عورت کی کیا صورت حال ہے اور مغرب کس طرح عورت کو اپنے مقام سے محروم کرنے کے درپے ہے۔

عورت کا مقام ومرتبہ

عورت کے مقام کا تجزیہ

عیسائیت میں آدم اور حوا کی تخلیق کے حوالے سے یہ بات ملتی ہے کہ ''خدا نے مرد کو بالکل اپنی شکل Image پر تخلیق کیا اور عورت کو مرد کے 'امیج' پر پیدا کیا۔'' عیسائی لٹریچر میں آدم کے جنت سے نکالے جانے کا تمام تر ذمہ دار حوا کو قرار دیا گیا ہے۔ حوا کے اس 'تصور' کی بنا پر مسیحی یورپ میں صدیوں تک عورت گناہ کی پوٹلی، اور گھٹیا مخلوق تصور کی جاتی رہی ہے۔ بی بی حوا کو اِسی لیے eve بھی کہا جاتا ہے جو کہ انگریزی لفظ Evil یعنی برائی سے ماخوذ ہے۔ مسیحی زبان وادب میں عورت کوئی آزاد عقلی یا سماجی وجود کی حامل ہستی نہیں ہے، وہ بس مرد کا ایک عکس ہی ہے۔ اسی لیے عورت کے لیے انگریزی زبان میں Woman کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا لفظی مطلب ہے 'آدھا مرد'۔ اسی طرح She بنیادی طور پر He کا ضمیمہ ہے۔ عورت کے لیے دوسرا لفظ Female ہے، یہ بھی اصل Male کے نصف کا مطلب ظاہر کرتا ہے۔''[۱]

۱۶۷۳ء میں معروف پادری رچرڈ باکسٹر نے A Christion Dictionary میں عورتوں کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

> "They are betwixt a man and child: Some few have more of the man, and many have more the child; but most are but in the middle state"[۲]
>
> یعنی ''وہ مرد اور بچے کے درمیان ہیں، کچھ تو مردوں کی خصوصیات زیادہ رکھتی ہیں، بہت سی بچگانہ مزاج کی زیادہ حامل ہیں، جبکہ زیادہ تر درمیانی حالت والیاں ہیں۔''

اہلِ مغرب کی اس تشریح کے مطابق تو تمام عورتیں 'نصف مرد کے درجہ پر بھی فائز نہیں ہیں، کیونکہ ان میں بچگانہ صفات پائی جاتی ہیں۔

صرف علامہ اقبالؒ یا مسلمان مصنّفین نے ہی باغیانہ مزاج رکھنے والی مادر پدر آزاد عورتوں کو نشانہ تنقید نہیں بنایا ہے

۱۔ عطاء اللہ صدیقی، نازن، ماھنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴، ص ۱۱۳

۲۔ A Christion Dictionary بحوالہ عطاء اللہ صدیقی، نازن، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴، ص ۱۱۳

بلکہ یورپ میں اس طرح کی تحریریں سترھویں صدی یا اس سے قبل کے دور میں بھی مل جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ میں 'تحریکِ نازن' کی اِکا دُکا مبلّغات اس تحریک کے باقاعدہ آغاز سے کہیں پہلے اپنے باغیانہ، اور غیر فطری رویوں کا اظہار کر چکی تھیں۔ ۱۶۲۰ء میں Anon نے The man-woman کے عنوان سے رسالہ تحریر کیا جس میں ان عورتوں کی شدید مذمت کی جو مردوں کی طرح کا لباس پہنتی ہیں یا اُن جیسے کام کرتی ہیں۔ ۱۶۴۷ء میں فرڈیننڈ لنڈ برگ نے Modern Woman; the lost sex (جدید عورت: صنفِ گم گشتہ) کے نام سے تحریکِ نازن کے خلاف بہت موثر کتاب لکھی۔ اس کتاب کے پہلے باب کا عنوان نازَن کے خلاف کس قدر نفرت کے جذبات لیے ہوئے ہے۔ ملاحظہ کیجئے: Chimaera; or Modern Woman یعنی ''چڑیل (ڈائن) یا جدید عورت۔''

Webster کی ڈکشنری کے مطابق Chimaera یونانی اَصنام پرستی Mythology میں ایک چڑیل عورت کو کہتے ہیں جو منہ سے آگ کے شعلے نکالتی تھی، جس کا سر شیر کا تھا، جسم بکری کا اور دُم سانپ کی تھی۔ یہ اصطلاح ایک مغربی مصنف نے جدید عورتوں کے لیے استعمال کی ہے۔ 'نازَن' تو اس کے مقابلے میں بے حد کم درجے کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ مغربی نازَن، کے افکار اور اعمال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واقعی وہ Chimaera ہی کی نسل لگتی ہیں۔ ان کی زبانیں ہر وقت مردوں کے خلاف اَنگارے برساتی ہیں، ان کی سوچ میں ربط ہے نہ تعلق، ان کی باتوں کا سر پیر کوئی نہیں ہے.....''

مشرق میں عورت کی حالت

عرب عورت کی نسوانیت محفوظ ہے

اگر دنیا تعصب کی نظر سے نہ دیکھے تو اسے فرق بہت واضح طور پر محسوس ہوگا۔ عرب معاشرے مثالی اسلامی معاشرے نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اسلامی معاشرے ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے معاشرے ہیں۔ وہاں اسلام کے اثرات تاریخی، تدریجی، معاشرتی اور ثقافتی رویوں میں موجود ہیں۔ اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا کیے ہیں، وہ بھی اسے کما حقہ حاصل نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ان معاشروں کے اسلامی تعارف کے پس منظر میں مضبوط اسلامی اقدار موجود ہیں۔ وہاں نسوانیت پوری طرح محفوظ ہیں۔ اسے آبرو کا تحفظ اور سلامتی کا خطرہ درپیش نہیں ہے۔ عرب دنیا میں تو اسلامی قدروں کا لحاظ و پاس بہت گہرا ہے، آیئے افریقہ کے ایک انتہائی پسماندہ ملک کا ایک واقعہ سامنے رکھیں۔

یہ واقعہ بی بی سی ٹو کی پروڈکشن کوآرڈی نیٹر میری واکر (Mary Walker) نے تحریر کیا ہے، وہ بی بی سی کی سیر پر (Living Islamic) کے لیے 19 مختلف ممالک میں گئیں۔ وہ اپنی ٹیم میں واحد خاتون رکن تھیں۔ ان کا پہلا دورہ مالی کا تھا۔ وہاں ان کا تاثر تھا کہ کن گھروں کے کن کمروں میں مُجھے جانے کی اجازت ہوگی اور کن کمروں میں جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ انھوں نے اپنے مشاہدات میں لکھا:

> ''مالی میں جس مسلم خاتون سے میری پہلی ملاقات ہوئی اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ ایک مسلم خاتون کے بارے میں مجھے اپنے پہلے سے قائم شدہ تصورات کو ختم کرنا ہوگا۔ وہ ایک شیخ کی اہلیہ تھیں۔ شیخ دیہاتی بت پرستوں کو اسلام کی جانب راغب کرنے کی خاطر تبلیغ کرتے تھے۔ وہ ایک انتہائی نازک،

اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں جن کے سابقہ شوہر ایک سفارت کار تھے۔ انہوں نے مغربی طرز زندگی کو خیر باد کہہ کے پردے کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔ میری نگاہ میں انہوں نے خود کو عمر قید سنائی تھی۔ لیکن یہاں تو کوئی قیدی نہ تھا، نہ کوئی غریب پسماندہ غلام۔ میرے سامنے ایک انتہائی ذہین اور گہرا اثر ونفوذ رکھنے والی خاتون کھڑی تھی۔ یہ وہی تھی جو کبھی ''پتلون'' پہنتی تھی۔ یہاں ان کی خلوت میں بھی ایک وقار تھا، آبرو بھی، اور اس اس خلوت نے انہیں یہ اختیار دے رکھا تھا کہ وہ گھر کے بند دروازوں کی اوٹ سے حکم دے اور اس کے اس مقام پر کسی طرح کا تنازع بھی نہ تھا۔ وہ سارے امور کی نگران تھی، وہ گھر کی نگران تھی اور وہ اپنے شوہر کے تمام امور اور سرگرمیوں کا باقاعدہ شیڈول بناتی تھی۔ گویا وہ یہاں بھی نگران تھی۔''[۳]

میری واکر لکھتی ہیں:

''مغرب میں اختیار حاصل کرنے والی عورت کو ایک بڑے تنازعے کا سامنا ہے، اسے اپنی نسوانیت اور اس کے جملہ استحقاق کے تحفظ کا سامنا ہے۔ وہ اپنی نسوانیت سے جن رویوں کو منسلک کرتی ہے اور اپنے نسوانی کردار کے گرد حدوں کو توڑنا چاہتی ہے اور ان حدود سے باہر نکلنا چاہتی ہے جو کہ مرد چاہتے ہیں کہ توڑے اور باہر نکل آئے۔ میں جہاں کھڑی تھی وہاں یہ عورت تھی جس نے ان حدود کو اپنے لیے استحقاق میں تبدیل کر لیا تھا۔''[۴]

میری واکر نے ایک اگلے دورے کی روداد بھی اسی جائزے میں لکھی۔ وہ لکھتی ہے:

''شمالی نائیجیریا میں میرا اگلا پڑاؤ تھا۔ وہاں پر مزید دو خواتین سے ملی۔ ان دونوں نے میرے خیالات کو مزید تبدیل کر دیا۔ یہ دونوں خواتین ایک شیخ ذکی کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ شیخ جہاد کی بہت زور وشور سے تبلیغ وتلقین کرتے تھے اور اپنے پیروکاروں پر زور دیتے تھے کہ ایران کی مثال پر غور کرو، اس پر عمل کرو۔ ایک مغربی استعماری حکومت کو ختم کر کے ایک اسلامی ریاست قائم کرو۔ زینہ ابراہیم شیخ کی اہلیہ اور فاطمہ یونس زینہ کی سہیلی تھیں۔ ان دونوں نے رضا مندی کا اظہار کیا کہ وہ اسلام میں عورت کے کردار پر انٹرویو دیں گی۔ انہوں نے پردہ کر رکھا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ وہ کسی خاتون سے ہی بات کریں گی۔ میرے پروڈیوسر نے مجھے کہا کہ میں ان کا انٹرویو کروں۔ میں بہت پریشان تھی کیونکہ میں نے پہلے سے انٹرویو نہیں کیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ میری تحریک نسواں سے ہمدردیاں ان خواتین کو مشتعل کر سکتی ہیں۔ لیکن یہی وہ ہمدردیاں تھیں جس کے بارے میں زینہ اور فاطمہ مجھ سے ہی سوالات کرتی رہیں۔ یہ خواتین بھی تعلیم یافتہ اور بہت اچھی طرح سے بات کرنا جانتی تھیں۔ انہوں نے بھی مغربی طرز زندگی کو مسترد کر دیا جسے میں سمجھتی تھی کہ اسلام سے بہت بہتر ہے اور ایک عورت کو اسلام کے مقابلے

۳۔ مرزا محمد الیاس، عرب عورت کی نسوانیت محفوظ ہے، ماہنامہ آئین، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۸۱ ۴۔ ایضاً

میں بہت کچھ دیتا ہے۔''۵

جیسے ہی میں اپنی نشست پر بیٹھی تو ایک نظر نہ آنے والی سرحد مجھے محسوس ہوئی جو مردوں کے حصہ کو عورتوں کے حصہ سے الگ کرتی تھی۔ ہم صحن میں تھے اور ایک پردہ حائل تھا۔ پردے کے اس طرف عورت کی مکمل حکمرانی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دنوں میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور مختلف مقامات پر گئی ہوں لیکن یہ صورتِ حال قطعی مختلف ہے۔ یہاں میری موجودگی کو ایک ''اعزازی مرد'' کی حیثیت سے عارضی طور پر قبول کیا گیا تھا۔ ہم اب تک پرانے زمانے کی صلوٰۃ کی تقریبات کی فلم بناتے رہے تھے جن سے رمضان کے خاتمے کا اعلان ہو رہا تھا۔ مرد، مرد اور ہر طرف مرد ہی تھے۔ نماز عید کی صبح کوئی 5 لاکھ مرد جمع تھے۔ ہر طرف سے مرد اپرف کانو کے صحن میں اس نماز کی ادائیگی کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ میں ان کی بہت ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے مجھے اجازت دی کہ میں یہ تقریبات دیکھ سکوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے ایک قیمت ادا کرنا تھی۔ وہ قیمت یہ تھی کہ میں اپنی نسوانیت کو ہر اعتبار سے ڈھانپ کے رکھوں گی۔''۶

میری واکر نے انٹرویو کا حال یوں بیان کیا ہے:

''خواتین نے بات شروع کی اور ان کی گفتگو سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری اپنی ذات کی دوبارہ قدر و منزلت کی بات ہو رہی ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ یہ پردہ ناقابلِ قبول اقدار کے ایسے نظام کو مسترد کرنے کا اظہار اور اعلان ہے جس نے عورت کی تذلیل کی ہے جب کہ اسلام نے ایک عورت کو عزت اور احترام کا مقام عطا کیا ہے۔ یہ آزادی ہرگز نہیں ہے جہاں آپ کا کہنا ہے کہ عورت کو برہنہ ہو کر جانا چاہیے۔ یہ سراسر ظلم اور استحصال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد چاہتے ہیں کہ وہ عورت کو برہنہ دیکھیں۔''۷

جس طرح ہمیں لگتا ہے کہ پردہ مسلمانوں نے استحصال کے لیے ایجاد کیا اسی طرح وہ سمجھتی تھیں کہ منی سکرٹ اور ابھرتے ہوئے اور کشادہ سینے دراصل استحصال کی علامت ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ مغرب میں مرد عورت کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ ہمیں کہتا ہے کہ یقین کرو کہ ہم آزاد ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں وہاں مرد کی نظر کا غلام بنا دیا گیا ہے میں نے جس قدر اس بات پر زور دیا کہ مجھے آزادی ہونی چاہیے کہ میں جو چاہے پہن سکوں میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ میری یہ پسند دراصل یہ ارادہ اپنے اندر رکھتی ہے کہ میرے جسم کو مرد دیکھیں اور اس میں کشش محسوس کریں۔ عورتیں اپنی ظاہری حیثیت میں اپنی شناخت کو خود سے الگ نہیں کر سکتیں اور یوں وہ مسلسل تحریک نسواں کی جدید دنیا کی غلام رہتی ہیں جس کے قاعدے قانون مرد نے تحریر کیے ہیں۔''

مغربی عورت کی آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی کی حقیقت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ

۵۔ مرزا محمد الیاس، عرب عورت کی نسوانیت محفوظ ہے، ماہنامہ آئین، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۸۱

۶۔ ایضاً ۷۔ ایضاً

اس کی زندگی میں ایک وقت وہ تھا، جب اسے مذہبی، سیاسی، سماجی ہر لحاظ سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ اسے گناہ کی جڑ اور بدی کا سرچشمہ قرار دیا جاتا تھا اور سماجی لحاظ سے بھی اسے وہ مقام حاصل نہیں تھا جو اس صدی میں اس نے حاصل کیا ہے۔ تحریکِ آزادیِ نسواں نے 19 ویں صدی کے اواخر میں مغربی عورتوں میں بیداری کی لہر اٹھائی اور بیسویں صدی کے آغاز میں 'عورتوں کے حقوق' کی آواز بلند کی گئی۔ 1907ء میں اس تحریک نے پیش قدمی کی اور سیاسی لحاظ سے بھی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن ان کامیابیوں کے حصول کے بعد مغربی عورت نے معاشرے کی تشکیل اور خاندان (Family) کی طرف سے اس پر عائد فرائض اور ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ شادی (نکاح)، شوہر، گھر، بچے اور پھر ان کی تعلیم و تربیت اس کا آئیڈیل نہ رہے بلکہ اس نے ان تمام اداروں سے چھٹکارا حاصل کر کے مادی ترقی اور گھر سے باہر کی آزادی (Freedom to come out of four walls) کو اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ اسی کے نتیجے میں مغربی معاشرہ اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔

پاکستان میں بھی اب ہمیں کچھ ایسے ہی مسائل و معاملات سے سابقہ درپیش ہے۔ یہاں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ یا شہری زندگی کی خوگر عورت کے لیے اس کے اصل مقصدِ حیات کو پس پشت ڈالتے ہوئے نئی اور آزاد دنیا کا خواب سجایا جا رہا ہے۔ روشن مستقبل، بہتر معیارِ زندگی، معاشی جدوجہد، معاشرتی مقام و مرتبے (Social status) کا حصول، ملازمتوں کے لیے دوڑ دھوپ جدید عورت کا مطمحِ نظر بن چکا ہے۔ مردوں کی طرح مسابقت (Compitition) کے جذبے کو پروان چڑھانا، اسے مرد کے مدِ مقابل لا کھڑا کرنا، گھر کی زندگی کو قید خانہ اور دقیانوسیت کے طور پر پیش کرنا، زندگی کے تمام اہم معاملات مثلاً نکاح اور گھر داری وغیرہ کا فیصلہ خود اپنے ہاتھ میں لینے کی سوچ پیدا کرنا اور پھر انہیں اس کے سامنے خوب صورت انداز و تصورات میں پیش کرنا مغربی میڈیا اور مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر طبقے کا اصل مقصد بن چکا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید اور تعلیم یافتہ مسلمان عورت کے لیے اسلامی حدود، اقدار و روایات کے اندر رہتے ہوئے معاشی تحفظ اور سماجی مقام و مرتبے کا حصول کیسے ممکن ہو؟ ظاہر بات ہے کہ جب عورت کو گھر، شوہر اور بچوں سے آزاد کر دیا جائے اور باپ [یعنی مرد] بھی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے بری الذمہ ہو جائے تو پھر نئی نسل کے لیے تمام حدود، قوانین، اقدار و روایات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس پر نہ تو مذہب کی طرف سے کوئی دباؤ ہوتا ہے اور نہ معاشرے اور خاندان کی طرف سے۔ اس طرح نئی نسل مذہبی اور معاشرتی و سماجی لحاظ سے تمام پابندیوں سے ماورا ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے مسلم معاشرے بھی مغربی معاشرے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوں، ہمیں ان مسائل و معاملات کو سمجھنا ہے اور پھر اسلام کے مطابق ان کا حل بھی پیش کرنا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب عورت اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے تو گھر بار اور دنیاوی سکون غارت ہو جاتا ہے۔ بے شک اس کے نتیجے میں حاوی دولت تو میسر آ جاتی ہے لیکن عورت، عورت نہیں رہتی۔ اس کی گود اجڑ جاتی ہے۔ اس کی آرزوئیں، تمنائیں، خواہشیں سب چکنا چور ہو جاتی ہیں اور وہ ساری زندگی یکہ و تنہا، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دارِفانی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی خاندانی نظام نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی شرح میں اضافہ اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز جنسی تعلقات کی کثرت اس نظام کو حیوانیت کی طرف لے جا رہی ہے۔ اسی

سبب سے بچے پیدا کرنے کی' عورت کی فطری خواہش دم توڑ رہی ہے اور پیدا شدہ بچوں کو (Day Care Centres) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔[۸]

عورت کو جدیدیت کی آڑ میں اپنے محور سے توڑنے اور گھر کی محفوظ چار دیواری سے نکال کر، مرد کے مقابلے پر لاکھڑا کرنے کے نتیجے میں جو کش مکش اور تحریب کے مظاہرے آج دیکھنے کو مل رہے ہیں، اس کے حل کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں اصناف کے حدود اور ذمہ داریوں کی نشاندہی کر کے اس کشمکش کو باہمی تعاون اور ایک تعمیری جذبے میں بدل کر اس کو اصلاح معاشرہ کے لیے استعمال میں لایا جائے۔

مرد اور عورت کے دائرہ کار کا اختلاف

اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مرد اور عورت دونوں کے دائرہ کار کو متعین کر دیا ہے۔اس امر میں تو اختلاف کی کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں کہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو الگ الگ مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کی ذہنی و عملی صلاحیتوں میں قدرتی فرق کو بھی تسلیم کیا جائے اور اس فرق کی بنیاد پر دونوں کے دائرہ کار کے اختلاف کو بھی۔ اگرچہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں انسانی زندگی کے لیے ناگزیر اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔عورت مرد سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور مرد عورت کو نظرانداز کر کے زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ تاہم دونوں کی ذہنی صلاحیتوں میں فرق ہے، دونوں کا مقصد تخلیق الگ الگ ہے اور دونوں کے دائرہ کار ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہیں۔

مثال کے طور پر مرد کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ عورت کو بارآور کر سکتا ہے، لیکن خود بارآور نہیں ہو سکتا۔اس کے برعکس عورت کے اندر صلاحیت رکھی ہے کہ وہ بارآور ہو سکتی ہے، لیکن وہ بارآور کر نہیں سکتی۔ گویا مرد کے اندر تخلیق و ایجاد کا جوہر رکھا گیا ہے تو عورت کو اس تخلیق و ایجاد کے ثمرات و نتائج سنبھالنے کا سلیقہ اور ہنر عطا کیا گیا ہے۔اسی طرح اگر مرد کو حکمرانی و جہانبانی کا حوصلہ عنایت کیا گیا ہے تو عورت کو گھر بسانے کی قابلیت بخشی گئی ہے۔ مرد کے اندر قوت و عزیمت کے اوصاف رکھے گئے ہیں تو عورت کو دل کشی و دل ربائی کا جمال عطا کیا گیا ہے اور اس کارخانۂ عالم کی زیب و زینت کسی ایک ہی صنف کے اوصاف سے نہیں ہے بلکہ دونوں قسم کے اوصاف سے ہے اور دونوں ہی انسانی معاشرے کے اہم رکن ہیں۔''

انسانی معاشرے کا وجود، اس کی بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے کہ ساری اہمیت بس اسی کو دے دی جائے اور دوسرے کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس پہلو سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں البتہ خصوصیات اور صلاحیتیں دونوں الگ الگ لے کر آئے ہیں۔ اس لیے مرد جو کام کر سکتے ہیں عورتیں وہ سارے کام نہیں کر سکتیں، لیکن ایسے مردانہ کام نہ کر سکنا، عورت کی تحقیر نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کے بعض کام مرد نہیں کر سکتے، تو اس میں ان کے لیے حقارت کا کوئی پہلو نہیں۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اعمال کے مکلّف ہیں۔ اس لیے اسلام اسی بات کو پسند کرتا ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اپنے دائرے میں کام کر کے قدرت کے منشا کی تکمیل کریں۔ ایک دوسرے کے کاموں میں دخیل ہو کر فسادِ تمدن کا باعث نہ بنیں۔ وہ ایک دوسرے کے معاون ہوں' متحارب نہ ہوں؛ حلیف ہوں، حریف نہ ہوں؛

۸۔ صلاح الدین یوسف: طبقہ نسواں کے لیے اسلامی تعلیمات، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴ء

جو بھی انسانی معاشرہ اس فطری اصول سے انحراف کرے گا' امن وسکون سے محروم ہو جائے گا۔

عورت خاندان کا دل

اللہ تعالیٰ نے عورت کو گھر کی ذمہ دار بنایا تھا، گھر کی منتظمہ بنایا تھا کہ وہ خاندانی نظام استوار رکھ سکے، لیکن جب وہ گھر سے باہر آ گئی تو ہوا یہ کہ باپ بھی باہر اور ماں بھی باہر، اور بچے اسکول میں یا نرسری میں، اور گھر پر تالا پڑ گیا۔ اب وہ فیملی سسٹم تباہ اور برباد ہو کر رہ گیا۔ عورت کو تو اس لیے بنایا تھا کہ جب وہ گھر میں رہے گی تو گھر کا انتظام بھی کرے گی اور بچے اس کی گود میں تربیت پائیں گے۔ ماں کی گود بچے کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ وہیں سے وہ اخلاق و کردار سیکھتے ہیں، وہیں سے زندگی گزارنے کے صحیح طریقے سیکھتے ہیں، لیکن آج مغربی معاشرے میں فیملی سسٹم تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ بچوں کو ماں اور باپ کی شفقت میسر نہیں ہے، اور جب عورت دوسری جگہ کام کر رہی ہے اور مرد دوسری جگہ کام کر رہا ہے، اور دونوں کے درمیان دن بھر میں کوئی رابطہ نہیں ہے۔ دونوں جگہ پر آزاد سوسائٹی کا ماحول ہے۔ بسا اوقات ان دونوں میں آپس کا رشتہ کمزور پڑ کر ٹوٹنے لگتا ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے رشتے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ آخر کار اس کی وجہ سے طلاق تک نوبت پہنچتی ہے اور گھر برباد ہو جاتا ہے۔

عورت کو اس کی نسوانیت سے محروم کرنے کی سازش

مغرب میں برپا کی جانے والی 'تحریک آزادیِ نسواں' نے عورت کو جو مراعات اور آزادیاں بخشی ہیں، ان کی افادیت کے متعلق خود اہل مغرب کے درمیان بھی اتفاق رائے نہیں ہے، البتہ آزادی کے اس دو سو سالہ سفر کے بعد بلا شبہ عورت ایک نا قابل تلافی نقصان سے دو چار ضرور ہوئی ہے، وہ یہ کہ مغربی عورت اپنے عورت ہونے کے تشخص کو گم کر بیٹھی ہے۔ نسوانیت کا وہ انمول زیور جو فطرت نے عورت کو عطا کیا تھا، وہ برابری اور حقوق کی دھول میں ایسا گم ہوا ہے کہ اب اسے چراغِ رُخ زیبا کا سہارا لے کر بھی ڈھونڈنا چاہیں تو نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔ چراغ کی بات ہی الگ ہے، رُخِ زیبا کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ گھر کی پاکیزہ فضا سے نکل کر بازار، دفتر اور جنسی ہوس ناکی کی منڈیوں میں خوار ہو کر جمال پرور نسوانی چہرہ زمانے کی دھول سے اس قدر اَٹا ہوا ہے کہ حسن و جمال کا پیکر عجب بھبھوکی شکل اختیار کر گیا ہے۔ لیکن وائے افسوس! اس عظیم المیہ کا احساسِ زیاں جاتا رہا ہے، مغرب کی عورت اپنی مسخ شدہ فطرت کو بحال کرنے کی بجائے اسے مزید بگاڑنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا رہی ہے۔

تحریکِ نسواں کی علمبردار خواتین کو 'عورت' کہنا لفظ عورت کی توہین، بلکہ معنوی تحریف ہے۔ عورت کا لغوی مطلب 'چھپی ہوئی' مجسم حیا ہے۔ مغربی عورت نے پردہ اور حجاب سے بہت پہلے 'آزادی' حاصل کر لی تھی۔ مذکورہ تحریک کے زیر اثر شرم و حیا کا زیور بھی اتار پھینکا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی عورتوں کے لیے کون سا لفظ یا اصطلاح استعمال کی جائے۔ یہ ذمہ داری تو دراصل ان مغرب زدہ بیگمات کی تھی کہ وہ نسوانی تشخص سے جان چھڑانے کے بعد اپنے لیے نیا نام ایجاد کریں۔[۹]

۹۔ عطاء اللہ صدیقی، نازن، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴ ص ۱۰۷

ویسے تو ان کا ذہن مختلف جدت طرازیوں اور روایتی اصلاحات کی بجائے نت نئی جدت پسندیوں کی تحقیق کرتا رہتا ہے، لیکن لفظ 'عورت' کے متعلق ان کی تخلیقی صلاحیت ابھی تک سامنے نہیں آئی۔ وہ نجانے 'عورت' جیسی 'شرمناک' اور دقیانوسی اصطلاح اپنے لیے ابھی تک کیوں گوارا کیے ہوئے ہیں؟ وہ محجوب و مستور ہونے کو اپنے لیے توہین آمیز تصور کرتی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ 'عورت' کے لفظ کو استحصالی معاشرے کی اصطلاح سمجھتے ہوئے کوئی نئی اصطلاح وضع کریں۔ لگتا ہے اس معاملے میں وہ خود خاصی روایت پسند واقع ہوئی ہیں۔

عورت اقبال کی نظر میں

علامہ اقبالؒ نے مغرب سے اُٹھنے والی تحریک نسواں کی تباہ کاریوں کا یورپ میں مشاہدہ کرنے کے بعد مسلمان خواتین کو اس عظیم فتنہ سے بچنے کے لیے آج سے ۸۰ سال پہلے خبردار کر دیا تھا۔ انہوں نے جدید مغربی تعلیم کو مسلمان عورتوں کے لیے مہلک قرار دیا تھا۔ عورتوں کے حقوق کے نام پر برپا کی جانے والی تحریک کے اندر 'عورت دشمنی' کے عناصر کو ان کی حکیمانہ بصیرت نے بہت جلد بھانپ لیا تھا۔ اسی لیے اُنہوں نے فرمایا:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو ارباب ہنر موت[۱۰]

اس شعر میں انہوں نے حددرجہ بلیغ طریقے سے سامراجی نظامِ تعلیم کے ذریعے پھیلائے جانے والے علم کو عورتوں کے لیے اس قدر ضرر رساں محسوس کیا کہ اس کی تحصیل سے 'زن' اپنا تشخص کھو کر 'نازَن' بن جاتی ہے۔ گویا عورت، عورت نہیں رہتی۔ ایسا علم جو عورت کو عورت ہی نہ رہنے دے وہ اس کے لیے موت ہے۔ افرنگ زدہ عورتوں کے لیے 'نازن' سے زیادہ جامع، معنی خیز اور مفہوم کو صحیح ادا کرنے والا کوئی اور لفظ شاید ہی مل سکے۔

یورپ میں طبقہ اُناث اور ان کے بہی خواہوں کی طرف سے آزادی اور حقوق کے نام سے جو تحریک ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ شروع کی گئی تھی، اسے تحریکِ آزادی نسواں کا نام دینا بھی درست نہیں ہے۔ یہ تحریک قابل احترام، معتدل مزاج، تعلیم یافتہ، اعلیٰ خاندانوں کی بیگمات نے برپا نہیں کی تھی، وہ تو اس سے الگ تھلگ رہی تھیں۔ یہ تحریک میرے وولسٹن کرافٹ Mary Wolston Craft جیسی اعصابی و نفسیاتی امراض میں مبتلا، جنونی اور انتہا پسند عورتوں نے شروع کی تھی جو مردوں کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار تھیں اور جنہیں مردوں کی ہر میدان میں برابری کا خبط اور مالیخولیا لاحق تھا۔ اس لیے اس تحریک کو تحریکِ نسواں کی بجائے اگر 'تحریکِ نازَن' کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ مغرب میں اس تحریک نازن کی شروع میں اچھی خاصی مذمت کی جاتی رہی۔ اسے معاشرتی توازن کے لیے خطرناک خیالات پر مبنی تحریک کا نام دیا گیا لیکن اس تحریکِ نازن کو زیادہ پذیرائی اس وقت ملی جب جان سٹورٹ مل جیسے آزادی پسند دانشوروں نے اس کی پرزور حمایت کی۔

۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کے 'نوائے وقت' میں معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا کہ عورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قسم تو 'خاتونِ خانہ' کہلاتی ہے جبکہ دوسری 'خاتون خانہ خراب'..... عطاء الحق قاسمی نے یہ فکاہی کالم مقبوضہ کشمیر کے کٹھ پتلی وزیرِ اعلیٰ فاروق عبداللہ کے اس بیان کے پس منظر میں تحریر کیا کہ اگر انہیں دوسرا جنم مل جائے تو وہ مرد کی بجائے

۱۰۔ علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، ضربِ کلیم، ''عورت اور تعلیم''، ص ۷۲۱

عورت کے روپ میں دوبارہ زندہ ہونا چاہیں گے۔ کیونکہ اگلی صدی میں عورتوں کو زیادہ حقوق حاصل ہوں گے اور شاید بچے پیدا کرنے کا فریضہ بھی مردوں کو ادا کرنا پڑے۔

قاسمی صاحب کے کالم میں جن عورتوں کے لیے 'خاتون خانہ خراب' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ وہ راقم الحروف کے خیال میں 'نازن' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔ 'نازن' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کا 'گھریلو اُمور' میں ہرگز دل نہیں لگتا۔ ان کی دلچسپیوں کا محور و مرکز بازار کا ماحول ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنی عدم توجہ کی وجہ سے اپنے گھر کا عملاً 'خانہ خراب' ہی کرتی ہیں۔ گرہستن ہونا ان کے نزدیک ایک ایسا عیب ہے کہ جسے وہ کبھی بھی اپنے نام کے ساتھ لکھنا پسند نہیں کرتیں۔

تحریک آزادیِ نسواں

آزادی وحقوق نسواں کا تاریخی جائزہ

آزادیِ نسواں کے حوالے سے انسانی تاریخ میں پہلی اور آخری بار اگر واقعی کسی نے بہت کچھ کیا تو وہ دینِ فطرت اسلام اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے جبکہ مغرب' جسے عام طور پر آزادیِ نسواں کا علمبردار سمجھا جاتا ہے' عورت کے ساتھ 'سنگین واردات' کی ہے۔

اسلام نے تو صدیوں پہلے معاشرے میں عورت کا احترام متعارف کرایا، اسے ناقابلِ فراموش آزادی سے ہمکنار کیا جبکہ مغرب کا عالم یہ ہے کہ فرانس میں ۱۸۹۰ء کے اعداد وشمار کے مطابق عورتوں کو مردوں کی نسبت آدھی اُجرت ملتی تھی۔ امریکہ میں ۱۹۱۶ء میں عورتوں کو مردوں کی نسبت آدھی تنخواہ ملتی تھی۔ جرمنی میں بھی انہی دنوں عورتوں کو مردوں کی تنخواہ کا ایک چوتھائی ملتا تھا اور ۱۹۴۲ء تک فرانسیسی قانون کے مطابق بیوی پر خاوند کی 'غیر مشروط' تابعداری اور اطاعت قانوناً فرض تھی۔

عورتوں کے حقوق کے حصول کی داستان آسٹریلیا میں ۱۸۹۰ء نیوزی لینڈ میں ۱۸۹۳ء اور امریکہ میں ۱۹۶۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ مغرب میں عورت 'مویشی' کی سطح سے گزر کر جبری نیلامی سے گزرتی ہوئی آج جس مقام پر ہے' وہ دراصل اس کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں' معاشی اور صنعتی حالات کے جبر کا نتیجہ تھا۔

دنیا کی قدیم ترین جمہوریت برطانیہ میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں قانون سازی کی ابتداء ۱۸۸۲ء ہوئی' جس کے تحت پہلی مرتبہ وہاں کی عورت کو کمانے' اپنی کمائی علیحدہ رکھنے اور اس پر تصرف کا اختیار اس وقت ملا جب صنعتی انقلاب کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ عورت سستی مزدور تھی' زیادہ قابلِ بھروسہ تھی اور عورت میں مرد کارکن کی نسبت جارحیت بھی بہت کم تھی۔ یعنی عورت سے یونین سازی اور ہڑتال بازی کا خطرہ نہ تھا۔ سو ایک سوچی سمجھی سکیم اور سازش کے تحت 'عورت کی آزادی' کا آغاز کیا گیا۔

پھر جوں جوں مشینوں کی تعداد' استعداد اور اقسام میں اضافہ ہوا اور پروڈکشن کا گراف گاہکوں کی اصل ضرورتوں سے کہیں اونچا نکل گیا تو اس کے نتیجے میں ''فن اشتہار بازی'' کے نام پر ''مصنوعی فروخت'' بذریعہ ''مصنوعی ضرورت'' کے صنعتی فراڈ کا تصور متعارف ہوا۔ بصری' سمعی' نفسیاتی اور معاشرتی طور پر مختلف حربوں سے زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی

نوبت آئی اور پھر اس ''کمرشل ضرورت'' کے نتیجے میں عورت کی کشش بلکہ عورت کی جنسی کشش کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت کے تحت عورت کو مزید ڈھیل دی گئی یعنی عورت کو "Impose consumption on consumer" کے مقصد کے حصول کے لیے ایک ہتھیار اور حربے کے طور پر استعمال کیا گیا اور عورت کے اس بازاری' گھٹیا اور فحش استعمال پر ''آزادی نسواں''.....''مساوات'' اور ''برابری'' کے رنگ برنگے اور دل آویز لیبل چسپاں کر دیے گئے۔

مختصراً یہ کہ عورت کی ''آزادی اور احترام'' کے لیے مغرب نے جو کام تقریباً سو سال پہلے معاشی' صنعتی اور کاروباری ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت کیا' وہی کام اس سے کہیں مثبت' خوبصورت' بہتر' محترم اور انسانی فطرت کے مطابق صدیوں قبل عرب کے صحراؤں میں اسلام نے ''صنعت' نہیں 'فطرت' کے تقاضوں کے تحت سرانجام دیا تھا۔

کاش! مستقبل کی مائیں تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر 'اسلامی' اور 'مغربی' آزادی نسواں کا فرق محسوس کر سکیں۔

عالم اسلام میں تحریک آزادیٔ نسواں کا آغاز

اسلامی ممالک میں آزادی نسواں کی صدائے بازگشت سب سے پہلے مصر میں، پھر ترکی، ایران اور افغانستان میں شروع ہوئی۔ مصر میں خصوصی طور پر تحریکِ آزادی نسواں نے خدیو اسماعیل پاشا کے عہد حکومت (۱۸۶۳ء تا ۱۸۷۹ء) میں زور پکڑا اور عورتوں کے لیے جدید مغربی طرز کے سکول کھلنے لگے۔ آزادی کی اس تحریک میں جو بعد میں بہت پھیل گئی، مصر کے معروف ادیب اور سماجی مصلح قاسم امین (۱۸۶۳ء تا ۱۹۰۸ء) نے بڑا حصہ لیا۔ قاسم امین نے، جنہیں **مُحرِر المراۃ** (عورت کو آزادی دلانے والا) کا خطاب دیا گیا، آزادی نسواں کی تائید وحمایت میں دو کتابیں تحریر **المرا ۃ** (عورت کی آزادی) اور **المرأة الجديدة** (جدید عورت) تصنیف کیں۔

تحریکِ آزادیٔ نسواں کے افکار ونظریات کی توسیع واشاعت میں ہدیٰ شعراوی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۹ء) نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ بالائی مصر کے ایک علاقے میں پیدا ہوئیں۔ پورا نام نور الہدیٰ سلطان تھا، مگر ہدیٰ شعراوی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم وتربیت قاہرہ ہی میں حاصل کی، حفظ قرآن کے ساتھ فرانسیسی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ ۱۳ برس کی عمر میں چچا زاد بھائی علی شعراوی سے نکاح ہوا اور رخصتی عمل میں آئی، لیکن ایک سال بعد ہی سات سال کے لیے شوہر سے علیحدگی ہوگئی۔ اس دوران یہ تحریکِ آزادیٔ نسواں سے متعارف ہوئیں۔ ۱۹۰۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں پہلی بار خواتین کے لیے خواتین کے ذریعے لیکچرز کا اہتمام کیا۔ ۱۹۱۴ء میں خواتین کے اندر مغربی اندازِ زندگی پیدا کرنے کیے لیے **الاتحاد النسائی التهذیبی** کی بنیاد رکھی اور اسی مقصد کے لیے ایک دوسری انجمن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ ان تنظیموں کا مقصد ادب وثقافت کے خوشنما نعروں کے پردے میں مصری خواتین کو اسلام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ میاں اور بیوی نے مل کر اس فتنے کو خوب ہوا دی۔ ۱۹۱۹ء میں خواتین کی ایک احتجاجی ریلی منظّم کرنے کے بعد وفد پارٹی کی خواتین شاخ **لـجنة الوفد المر كزية للسيدات** (خواتین کے لیے مرکزی وفد کی کمیٹی) کی مرکزی صدر مقرر کر دی گئیں۔ ۱۹۲۳ء میں آزادی کے حصول کے بعد شعراوی نے '**الاتـحـاد النسائی المصری**' کی تاسیس کی اور اس کی صدر مقرر ہو کر مصر میں پہلی تحریک نسواں کی بھرپور قیادت کی۔ اسی سال روم کی ایک بین الاقوامی خواتین کانفرنس میں شرکت کے بعد وطن واپس

آئیں تو ایک سیاسی مظاہرے میں شرکت کرتے ہوئے پہلی مرتبہ عوام کے سامنے چہرے کا نقاب نوچ کر پھینک دیا، اس کے بعد بے حجابی ان کا شعار بن گیا۔

۱۹۲۴ء میں انہوں نے خواتین کے مفت علاج کے لیے 'دار التعاون الاصلاحی' (اصلاحی تعاون کا گھر) کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ۱۹۲۵ء میں فرانسیسی زبان میں ایک ماہنامہ (Egyptienne) جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء میں عربی زبان میں ماہنامہ "المصریة" کا بھی آغاز کر دیا گیا۔ ان دونوں رسالوں نے تحریکِ آزادی نسواں کے افکار ونظریات کی خوب اشاعت کی اور پردے سے متعلقہ اسلام کے روایتی تصورات پر حملے کیے۔

اسلامی جمہوریہ مصر میں تحریکِ آزادی نسواں کی مخالفت بھی بہت ہوئی۔ چنانچہ مصری خواتین کو اسلام کے نظام ستر وحجاب سے آگاہ کرنے اور اجنبی مردوں سے ان کے آزادانہ میل جول کے خلاف 'الاخوان المسلمون' کی خواتین شاخ الاخوات المسلمات نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ نعمت صلاتی نے التبرج اور مصر کے نامور محقق اور ماہر انشاء پرداز محمد فرید وجدی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۵۴ء) نے "امرأة المسلمة" لکھ کر اسلام کے نظام عفت وعصمت کا مؤثر انداز میں دفاع کیا۔ اسی کتاب کا ترجمہ برصغیر میں اسی دور میں مولانا ابوالکلام آزاد نے 'مسلمان عورت' کے نام سے کیا۔

مصر کے نامور عالم اور صاحب 'تفسیر المنار' جناب سید رشید رضا نے حقوق النساء فی الاسلام کے عنوان سے اسی موضوع پر ایک اہم کتاب تالیف کی، اس کتاب کی تحقیق وتخریج بیسویں صدی کے نامور محدث علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ کی۔ اس دور میں نامور اہل علم نے اس موضوع کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت میں عربی اور دیگر زبانوں میں کئی کتب تالیف کیں۔[۱۱]

الاخوان کی ایک اہم ادیبہ اور مصنفہ زینب الغزالی (پیدائش ۲ جنوری ۱۹۱۷ء- وفات ۲۰۰۸ء) نے بھی تحریکِ آزادی نسواں کے سیلابِ بلاخیز کے آگے بند باندھنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ زینب نے نوجوانی میں ہدیٰ الشعراوی کی تحریکِ نسواں میں شمولیت اختیار کی، مگر جلد ہی یہ حقیقت سمجھ میں آ گئی کہ یہ تحریک آزادی اور حقوق کے نام پر خواتین کو گمراہ کر رہی ہے اور یہ کہ اسلام نے خواتین کو ہر قسم کے حقوق فراہم کیے ہیں، اس لیے مزید کسی تنظیم یا نظام سے وابستگی فضول ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ۱۸ برس کی عمر میں آپ نے جماعة السیدات المسلمات کی بنیاد رکھی اور مسلم خواتین وطالبات کو اسلام کے لیے جدوجہد پر اُبھارا۔ حکومت نے اس تنظیم کی مقبولیت اور توسیع کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں اس پر پابندی لگا دی۔ اس وقت اس کے ارکان کی تعداد ۳۰ لاکھ کے قریب تھی جو بلاشبہ ایک حیرت انگیز امر ہے۔

عالمی تحریکِ نسواں کا نیا دور

۱۹۴۰ء کی دہائی کے بعد تحریکِ نسواں کی عالمی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اگرچہ روزِ اول ہی سے اس تحریک کی بنیاد روایتی اور قدیم طرز کے تمام اداروں اور نظریات (جس میں مذہب' خدا، الہامی ہدایت کی ضرورت اور وجود، اور روایتی خاندان اور شادی جیسے بنیادی ادارے شامل ہیں) کے مکمل انکار پر قائم تھی۔ تاہم ۲۰ویں صدی سے پہلے اس

۱۱۔ محمد آصف احسان عبدالباقی، آزادئ نسواں یا فحاشی کا فروغ، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۲

بغاوت اور انکار میں اتنی شدت نہیں آئی تھی جتنی ۱۹۲۰ء کی دہائی کے بعد نظر آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انیسویں صدی کے اواخر تک اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں عورتوں کو معاشی' معاشرتی' مذہبی' سیاسی اور خاندانی حقوق دلوانا تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک جب تقریباً تمام یورپ اور امریکہ کی عورتیں بنیادی انسانی حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں جس میں ووٹ اور تعلیم' شادی کرنے اور شادی سے علیحدگی کا حق' وراثت اور بچوں کی ملکیت جیسے حقوق شامل تھے' تو حقوقِ نسواں کی اس تحریک نے بھی اپنے مقاصد اور منزل کا نئے سرے سے تعین کیا۔

''اہداف کی یہ تبدیلی اتنی واضح اور بھرپور تھی کہ نظریاتی اور ایجنڈا کے اعتبار سے اس کو حقوقِ نسواں کی تحریک کے مختلف ادوار میں ایک U-turn سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مشہور Feminist مصنفہ میرے وولسٹن کرافٹ کے الفاظ میں' عورتوں کا یہ سفر ان کے جائز حقوق (Legitimate rights) سے شروع ہو کر ان کے لیے ناجائز مراعات (Illicit privileges) پر ختم ہوگا۔ اس پس منظر میں میری کے یہ الفاظ ایک حقیقت کا اعتراف بھی ہیں اور ایک سچ ہونے والی پیشین گوئی بھی۔''[۱۲]

پھر ۱۹۴۰ء کے بعد ''حقوق انسانی کے منشور'' (Humanist Manifesto II) کی منظوری نے اس تحریک کے در پردہ اصل عزائم کو بے نقاب کیا۔ یعنی وہ تمام امور جو کہ پہلے معاشرتی اور مذہبی دائرہ عمل کے اندر رہ کر طے کیے جاتے تھے' اب فرد کی ذاتی صوابدید اور انتخاب (Free will) پر چھوڑ دیے گئے۔

اس ضمن میں انسانی زندگی کے جو پہلو خاص طور پر متاثر ہوئے اس میں مرد و عورت کا باہمی تعلق' عورت کی نفسیاتی اور جسمانی ضروریات اور ذمہ داریاں' جنسی آزادی' شادی بیاہ اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی اولاد' ان کی دیکھ بھال اور پرورش وغیرہ کے امور شامل تھے۔ انسانی آزادی کے منشور کے مطابق عورت اور مرد اپنی جسمانی اور جنسی ضروریات پورا کرنے کے معاملے میں مکمل طور پر آزاد قرار دیے گئے۔ اس سلسلے میں مذہب اور معاشرے کی قائم کردہ حدود و قیود کو انسانی نشو ونما اور قدرتی صلاحیتوں کے راستے میں ایک رکاوٹ قرار دیتے ہوئے فرد کو ان پابندیوں سے مکمل طور پر آزاد کر دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ حقوق نسواں کے علمبرداروں نے فطرت کے مقرر کردہ اصولوں اور قوانین کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے عورت اور مرد کو جنسی تسکین کے لیے صنف مخالف کی بجائے اپنی ہی صنف سے تعلقات قائم کرنے کو بھی جائز جانا اور انسانی آزادی اور انفرادی انتخاب (Human Will and Choice) کے نظریے پر عمل کرتے ہوئے صنفی آزادی (Sexual Freedom) یا آزاد جنس پرستی (Free sex) کا پر فریب اور گمراہ کن نعرہ بلند کیا۔ نتیجتاً بالغ افراد کے درمیان قائم ہونے والا ہر تعلق انفرادی معاملہ قرار پایا' جس میں معاشرتی اور مذہبی قانون کو نہ تو مداخلت کا حق ہے اور نہ اختیار۔ نہ صرف یہ بلکہ عورتوں کو بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال سے بری الذمہ کرتے ہوئے اسے ایک ریاستی فرض قرار دیا گیا۔ اس پر ستم یہ کہ ان تمام غیر فطری اور غیر انسانی مطالبات کو بنیادی انسانی حقوق (Fundamental Human rights) کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے اعلان کیا گیا کہ اگر فطرت اور اس کے مسلمہ قوانین ان کے حقوق کے راستے میں ایک رکاوٹ بنے تو انہیں بدلنے میں کوئی تامل اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا ۱۹۷۱ء میں مشہور جریدے نیو یارک ٹائمز میں شامل ایک مضمون نگار کے

۱۲۔ اسماء آفتاب، عالمی تحریک نسواں، ابن آدم نمبر، ماھنامہ بتول لاہور، ص ۱۳۴

الفاظ میں ''ہم جنس پرستی حقوق نسواں کے حصول کی راہ میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ یہ ایک طرح کا سیاسی احتجاج اور بغاوت کا اظہار ہے جو کہ مردوں کی بے جا حاکمیت اور ظلم کے خلاف عورتوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ ہم مذہب' قانون' رسم اور رواج میں مقید اپنے ذہنوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک بھرپور زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور اگر اس طرزِ زندگی کی کوئی گنجائش فطرت میں موجود نہیں ہے تو فطرت کو ہر حال میں تبدیل کیا جانا چاہیے''۔۱۳

لہٰذا اس نئے 'طرزِ زندگی اور سیاسی احتجاج' کے نتیجے میں مذہب اور معاشرے کی طرف سے لگائی گئی تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ یہاں تک کہ پاکیزگی اور عفت (Chastity and Virginity) اور وفاداری (Fidelity) کے مسلمہ اصولوں کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے انہیں Dogma اور Taboo قرار دیا گیا جو مذہب اور اخلاقیات نے عورتوں کی آزادی اور شخصیت کو کچلنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کی خاندان کی اہمیت کم ہوتی گئی اور لوگوں میں انفرادیت کا رجحان رواج پانے لگا۔ دوسرے کے لیے جینا اور دوسرے کے کام آنا اس ذہنیت کے لیے ایک اجنبی چیز بن کر رہ گئی۔ حالانکہ خاندان کی بنیاد یہی ہے کہ اس میں ایک طرف مرد اور عورت ایک دوسرے پر اپنی جان بھی نچھاور کر دیتے ہیں تو دوسری طرف وہ اپنے بچے کے لیے اعلیٰ انسانی جذبات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں بچے بھی والدین کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس طرح اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار پروان چڑھتی ہیں۔ لیکن جدید حقوق نسواں کے نتیجے میں جو ذہنیت بنتی ہیں اس میں ان چیزوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان تحریکوں نے خاندان کی بنیادوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا، جس کے نتائج اب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

پھر خاندانی اعتبار سے جو ادارے خاص طور پر تحریکِ نسواں کے زیرِ عتاب آئے' اس میں مذہب اور معاشرے کی 'پدر بنیاد' (patriarchal) حیثیت شامل تھی۔ مذہب اور خدا کو مردوں کے بنائے جانے والے بہت سے اداروں میں سے ایک ادارہ اور نظریہ قرار دیا گیا' جو صرف اور صرف مردوں کی ضروریات وخواہشات اور مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور اس کے بنیادی عقائد و ارکان نہ تو معاشرے کے ایک طبقے کے لیے مخصوص ہیں اور نہ ہی ایک خاص گروہ یا افراد اس کے مخاطب ہیں۔ اسلام اپنی فطرت میں نہ تو مردانہ (Macho) ہے نہ ہی نسوانی (Feminine) بلکہ یہ ایک دین فطرت ہے جو خالصتاً انسانی اخلاق و اقدار پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہونے کے باوصف انسانی ضروریات (جس میں مرد وعورت دونوں شامل ہیں) سے بخوبی واقف ہے۔ اسلامی احکامات و اقدار جو خاص طور پر معاشرے اور خاندان سے متعلق ہیں انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان احکامات کی تشریح جدید زمانے کے بنیادی تقاضوں اور ضروریات کو سامنے رکھ کر وسیع تناظر میں کی جائے تو یہ عورتوں کے حق میں باعث رحمت اور معاشرے کے لیے باعث سکون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسلمان علمائے دین کی ذمہ داری بہت اہم ہے۔ اندھی تقلید پیروی (Blind Obedience) اور جمود (Stagnance) نے انہیں بہت حد تک تحقیق وجستجو کے

۱۳۔ اسماء آفتاب، عالمی تحریک نسواں، ابن آدم نمبر، ماھنامہ بتول لاہور، ص ۱۳۴

جو ہر سے نا آشنا کر دیا جس کے نتیجے میں اسلامی فقہ لوگوں کے لیے احکام و ہدایات کا ایک لامتناہی اور نہ سمجھ آنے والا مجموعہ بن گئی ہے۔ جس میں عمل کرنے والا عنصر بہت کم جبکہ لاحاصل بحث وتمحیص کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کے متعلق اٹھنے والے ان منفی اور گمراہ کن افکار کا صحیح طور پر علمی طریق پر جواب دیا جائے' ورنہ موجودہ زمانے میں اٹھنے والے بہت سے فکری اور علمی مباحث اسلام کی معاشرتی اقدار اور خاندانی بنیادوں کے لیے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایک عقیدے کے طور پر عیسائیت کا زوال اس کے علما کی کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے ہوا جنہوں نے جدید ذہن میں اٹھنے والے شکوک وشبہات کا علمی جائزہ لینے اور جواب دینے کی بجائے انہیں پر تشدد طریقے سے ختم کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس کوشش میں خود ایک حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ گئی۔

آزادیٔ نسواں، حقیقی آزادی یا غلامی کا طوق

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا آزادیِ نسواں کی تحریکیں واقعی عورت کے لیے آزادی کا ذریعہ ثابت ہوئیں یا درحقیقت یہ ان کے لیے غلام کا طوق بن کر رہ گئیں۔ عورت کو آزادی و مساوات کے دلفریب نعروں کے دھوکے میں مبتلا کر کے اس کے لیے سیاست اور حکومت کے ایوان کھولے جا رہے ہیں، لیکن جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے نظر آئے گی کہ اس عرصے میں خود مغربی ممالک کی کتنی عورتیں صدر یا وزیراعظم بن گئیں؟ کتنی خواتین کو جج بنایا گیا؟ کتنی عورتوں کو دوسرے بلند مناصب کا اعزاز نصیب ہوا؟ اَعداد وشمار جمع کیے جائیں تو ایسی عورتوں کا تناسب بمشکل چند فی لاکھ ہوگا۔ ان گنی چنی خواتین کو کچھ مناصب دینے کے نام پر باقی لاکھوں عورتوں کو جس بیدردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں گھسیٹ کر لایا گیا ہے، وہ 'آزادیِ نسواں' کے فراڈ کا المناک ترین پہلو ہے۔ آج یورپ اور امریکہ میں جا کر دیکھیے تو دنیا بھر کے تمام نچلے درجے کا کام عورت کے سپرد ہیں۔ ریستورانوں میں کوئی مرد ویٹر شاذونادر ہی کہیں نظر آئے گا، ورنہ یہ خدمات تمام تر عورتیں انجام دے رہی ہیں۔ ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے، ان کے بستر کی چادریں بدلنے اور 'روم اٹنڈنٹ' کی خدمات تمام تر عورتوں کے سپرد ہیں۔ دوکانوں پر مال بیچنے کا یہ کام بھی عورتوں ہی سے لیا جا رہا ہے۔ دفاتر کے استقبالیوں پر عام طور پر عورتیں ہی تعینات ہیں۔ اور بیرے سے لے کر کلرک تک کے تمام 'مناصب' زیادہ تر اسی صنف نازک کے حصے میں آئے ہیں جسے 'گھر کی قید سے آزادی' عطا کی گئی ہے۔

پروپیگنڈے کی قوتوں نے یہ عجیب وغریب فلسفہ ذہنوں پر مسلط کر دیا ہے کہ عورت اگر اپنے گھر میں اپنے اور اپنے شوہر، اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اولاد کے لیے خانہ داری کا انتظام کرے تو یہ قید اور ذلت ہے، لیکن وہی عورت اجنبی مردوں کے لیے کھانا پکائے، ان کے کمروں کی صفائی کرے، ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میزبانی کرے، دوکانوں پر اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے اور دفاتر میں اپنے افسروں کی ناز برداری کرے تو یہ 'آزادی' اور 'اعزاز' ہے؟

پھر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عورت کسب معاش کے آٹھ آٹھ گھنٹے کی یہ سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرنے کے باوجود اپنے گھر کے کام دھندوں سے اب بھی فارغ نہیں ہوئی۔ گھر کی تمام خدمات آج بھی پہلے کی طرح اسی کے ذمے ہیں، اور یورپ اور امریکہ میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جن کو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانا پکانے،

برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔[۱۴]

عورتوں کو گھر سے باہر نکالنے کے لیے آج کل ایک چلتا ہوا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی نصف آبادی کو عضو معطل بنا کر قومی تعمیر و ترقی کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈال سکے۔ یہ بات اس شان سے کہی جاتی ہے کہ گویا ملک کے تمام مردوں کو کسی نہ کسی کام پر لگا کر مردوں کی حد تک 'مکمل روزگار' کی منزل حاصل کر لی گئی ہے۔ اب نہ صرف یہ کہ کوئی مرد بے روزگار نہیں رہا بلکہ ہزار ہا کام افرادی قوت کے انتظار میں ہیں۔

حالانکہ یہ بات ایک ایسے ملک میں کہی جا رہی ہے جہاں اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل مرد سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، جہاں کوئی چپڑاسی یا ڈرائیور کی اسامی نکلتی ہے تو اس کے لیے دسیوں گریجویٹ اپنی درخواستیں پیش کر دیتے ہیں اور اگر کوئی کلرک کی جگہ نکلتی ہے تو اس کے لیے ماسٹر کی ڈگریاں رکھنے والے دسیوں افراد اپنی درخواستیں پیش کر دیتے ہیں۔ پہلے مردوں کی 'نصف آبادی' ہی کو ملکی تعمیر و ترقی کے کام میں لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد باقی نصف آبادی کے بارے میں سوچیے کہ وہ عضو معطل ہے یا نہیں؟

اس سے معلوم ہوا کہ تحریک آزادیِ نسواں نے عورت کے لیے مصیبتوں میں اضافہ کیا، اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور وہ زینت خانہ کی جگہ شمع انجمن بن کر رہ گئی۔

تحریک نازن (Feminism) اور 'عورت' کا لفظ

تحریک آزادیِ نسواں کے ضمن میں ایک اور مسئلہ جو درپیش آیا وہ یہ تھا، اس سے عورت کی نسوانیت ہی ختم ہوگئی۔ اس لیے اب اس تحریک کے علمبردار عورت کو 'عورت' لکھنا اور بولنا بھی اس عار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جدید تحریکِ نسواں کی علمبردار 'عورتوں' کے لیے کسی مناسب اصطلاح یا لفظ کی تلاش کا مسئلہ صرف ان کے مخالفین کو ہی درپیش نہیں رہا ہے۔ فیمی نزم کے نظریات کے پرچارک بھی اس الجھن کا شکار نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ ایک انقلابی Feminist لکھتی ہیں:

"There is forever in feminist thought a problem of what term to employ when speaking of say "Women". The use of "Women" is problem atic, I know that there will be times when I say "Women" without meaning "all Women"[۱۵]

''نازن پسندانہ فکر میں ہمیشہ سے یہ مسئلہ رہا ہے کہ آخر جب 'عورت' کا ذکر کیا جائے تو کون سی اصطلاح استعمال کی جانی چاہیے۔ 'ویمن' کے لفظ کا استعمال تو مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بعض اوقات میں 'ویمن' (عورت) کا لفظ استعمال کرتی ہوں جبکہ اس سے میری مراد 'تمام عورتیں' نہیں ہوتیں۔''

گویا جدید انقلابی 'عورتیں' بھی عام روایتی عورتوں کو اپنے سے مختلف گردانتی ہیں۔

۱۴۔ تقی عثمانی آزادیِ نسواں کا فریب، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴، ص ۱۰۴

۱۵ Judith Evans, Feminist Theory Today, P:11

تحریکِ نازن کے لٹریچر میں 'مساوات' کے ساتھ Androgyny کی اصطلاح کثرت سے استعمال کی جاتی۔ چیمبرز ڈکشنری میں اس کے معانی درج ذیل ہیں:

"Having the charateriatics of both male and female in one individual."

یعنی ''ایک فرد میں مرد اور عورت دونوں کی خصوصیات کا جمع ہونا۔''

لیکن Judith Even نے اس لفظ کے جو معنی اپنی کتاب میں درج کیے ہیں وہ خاصے چونکا دینے والے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"Neither man, nore women." یعنی ''نہ عورت، نہ مرد۔'' ۱۶

اُردو زبان میں ایسے فرد کے لیے مخنث کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

یاد رہے تحریکِ نازن کا ہدف Androgynous معاشرے کا قیام ہے جہاں مرد وزن کے تمام امتیازات مٹا دیے جائیں گے۔ Gender (صنف) پر مبنی اختلافات کو مٹانا تحریک نازن کے اہم اہداف میں شامل ہے۔

Neil Lyndon کا نام تحریکِ نازن کے معروف ناقدین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے "The failure of feminism" اور "No more sex war" جیسی فکر انگیز کتابیں لکھی ہیں۔ تحریکِ نازن کے علمبردار انہیں Anti-Woman یعنی عورت مخالف ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔

اس الزام کی تردید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"It is perfectly illotical to say that somebody who espouses anti-feminist beliefs must be anti-woman. It makes no more sense than is would to say that an anti-Nazi must be anti-German or an anti-Communist must be anti-Russian."؟۱۷

''یہ کہنا قطعی طور پر غیر منطقی ہے کہ جو شخص 'نازن مخالف' خیالات رکھتا ہے وہ لازمی طور پر 'عورت مخالف' بھی ہو۔ یہ بالکل اس طرح ہوگا اگر کہا جائے ایک شخص جو نازیوں کے خلاف ہے، وہ ضروری طور پر جرمن قوم کا بھی مخالف ہو یا جو کمیونسٹوں کا مخالف ہے، وہ روسی قوم کے بھی خلاف ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں:

"Feminists do make a balit of advancing the claim to represent all Woman" ۱۸

''نازن پسندوں نے ایک عادت سی بنالی ہے کہ وہ تمام عورتوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

---

۱۶ Judith Evans, Feminist Theory Today, p. 29

۱۷ Neil Lyndon, No more sex, p. 10 ۱۸ Ibid

تحریک نازن اور خواتین کا عمومی رجحان

سوال یہ کہ کیا آزادیِ نسواں کے نعرے بلند کرنے والی خواتین کو ہمارے معاشرے میں کوئی پذیرائی بھی ملتی ہے اور کیا عام عورت کے لیے ان نعروں میں کوئی دلچسپی بھی ہے، یا یہ تحریکیں محض بیرونی ایجنڈے اور وسائل کی بنیاد پر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ پاکستانی معاشرے میں، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے عالم اسلام میں ان تحریکوں کو ایک فی صد بھی پذیرائی نہیں ملی۔

پاکستان میں این جی اوز کی بیگمات تمام پاکستانی عورتوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں، وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتی ہیں کہ وہ مغرب کے اتباع میں پاکستانی عورتوں کو جو حقوق دلوانا چاہتی ہیں، پاکستانی خواتین کی اکثریت ان میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ پاکستان کی عام عورت مغربی اقدار کے مقابلے میں اسلامی اور مشرقی اقدار کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔

مغرب میں آزادیِ نسواں کی انتہا پسند علمبردار عورتوں کو Manly woman کہا جاتا ہے یعنی وہ عورتیں جو مردانہ اوصاف کی حامل ہیں یا جو نسوانیت سے عاری ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنی کتاب 'پاکستانی عورت دوراہے پر' میں ایسی عورتوں کے لیے 'مترجلات' کی ترکیب استعمال کی ہے یعنی وہ عورتیں جو رَجُل (یعنی مرد) بننے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ 'نازن' اور 'مترجلات' یکساں مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔

ایلینر روز ویلٹ Eleaner Rosewelt امریکی صدر روز ویلٹ کی بیوی تھیں۔ انسانی حقوق اور حقوقِ نسواں کے حوالے سے ان کی خدمات کی بے حد تعریف کی جاتی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ کی جس کمیٹی نے 'انسانی حقوق کے آفاقی اعلامیہ' کا ڈرافٹ (مسودّہ) تیار کیا تھا، وہ اس کی چیئرپرسن تھیں۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں انہوں نے تحریکِ نسواں کی علمبردار خواتین میں انتہا پسندی اور آوارگی کا مشاہدہ کیا تو برملا اعلان کیا کہ وہ Feminist نہیں بلکہ Womanist ہیں۔ [۱۹]

امریکہ میں تحریکِ نسواں کے ارتقا پر نظر رکھنے والے قارئین بخوبی واقف ہیں کہ امریکہ میں ERA یعنی (Equal Right Amendment) یا (مساوی حقوق کی تقسیم) کی تحریک کو امریکی خواتین نے مسترد کیا۔ ایلینر روز ویلٹ بھی عورتوں اور مردوں کی مطلق مساوات کی قائل نہ تھی، وہ خاندانی اقدار پر یقین رکھتی تھی۔ اس نے ایک دفعہ کہا:

> ''عورتیں مردوں سے مختلف ہیں، ان کے جسمانی فرائض مختلف ہیں، ہماری نسل کا مستقبل اس بات سے وابستہ ہے کہ عورتیں کس قدر صحت مند بچے پیدا کرتی ہیں۔'' [۲۰]

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۹۱ کی یہ سطر ملاحظہ کیجئے:

> "Mrs. Roosewelt was so issitated by the equal rights emphasis of mainstreem American feminists that she refused to be labelled a feminist beself. (do)[۲۱]

---

۱۹ S.A. Hewlet, A lesser life, P: 91; بحوالہ عطاء اللہ صدیقی، نازن، ماہنامہ محدث، نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۴

۲۰ Ibid

۲۱ Ibid

''مسز روز ویلٹ امریکی نازن پسندوں کی مساوی حقوق کے بارے میں تکرار پر اس قدر مشتعل ہوئیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو Feminist کہلانے سے انکار کر دیا۔''

اسلام نے مرد و زن کی مساوات اور حقوق کا ایک متوازن تصور پیش کیا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو جدید دور میں معاشرتی توازن کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ کیونکہ مغرب کی تحریکِ نسواں اپنے نتائج کے اعتبار سے معاشرتی عدمِ توازن کا باعث بنی ہے!!

آزادی نسواں کے حوالے سے جتنی بھی کوشش کی گئی، اس سے قطع نظر کہ وہ مغرب سے اُٹھی یا مشرق سے، اس نے عورت کو منزل دینے کے بجائے اُسے گمراہی اور استحصال کے اُن دلدلوں میں دھکیل دیا ہے، جس سے نکلنے کی ہر کوشش منزل کو قریب لانے کے بجائے ایک بدتر انجام سے دوچار کروانے کا باعث بنی رہی ہے۔ اس کش مکش اور تہذیبی تصادم کو بعض لوگ نظریات و عقائد کی بنیاد پر ہونے والی رسہ کشی قرار دیتے ہیں اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے سیکولرازم یا بے دینی کو اپنانے کی تبلیغ کرتے ہوئے اس کو مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔

بہر حال ان کوششوں کے خاندان پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس نے عورت کی اپنے بچوں اور شوہر کے لیے یکسوئی کو شدید نقصان پہنچایا ہے، جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسی تحریک کے نتیجے میں مرد بھی اپنی ذمہ داریوں سے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ اور اب قانونی طور پر کوئی عورت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میرا شوہر میری معاشی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتا، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات مسلم ہے کہ اگر کوئی شوہر بیوی کے نفقہ کا انتظام نہیں کرتا تو وہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتی ہے۔

حقوق نسواں سے آزادیِ نسواں تک

ابتدا میں یہ تحریک عورت کے حقوق کی تحریک تھی جو بعد میں آزادی نسواں اور نسائیت کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ عنوان کی تبدیلی سے سرگرمی کی شدت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن بنیادی تصور تبدیل نہیں ہوا۔ اول و آخر بات حقوق پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے۔ مغرب میں عورت کے حقوق کا تصور ہمیں انیسویں صدی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ جان سٹوارٹ مل اور ہیریٹ ٹیلر (John Stuart Mill & Hairiet Taylar) نے ۱۸۶۹ء میں کہا تھا:

> If the principle of democracy is true, we ought to act as if we beleived it, and not to ordain that to be born a girl instead of a boy, any more than to be born black instead of white, or a commoner instead of a noble man, shall decide the person's position throughout life.۲۲

مغرب میں عورت کے حقوق کی جدوجہد ایک تاریخ رکھتی ہے۔ مغربی عورت کی موجودہ حیثیت اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس جدوجہد یا تحریک کو مختلف نام دیے گئے۔ حقوق نسواں، سفریجی تحریک، آزادی نسواں، نسائیت یا تحریکِ نسائیت (Women's right, Sufferage movement, Women Liberation movement, Feminism or Feminist movement) کہا گیا۔

۲۲۔ ڈاکٹر خالد علوی، عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۵۱

ابتدا میں یہ حقوق کی جدوجہد تھی لیکن اس میں تھوڑی سی توسیع کرکے اسے خاندان یا معاشرے میں عورت کے استحصال کے شعور و ادراک سے تعبیر کیا گیا۔ یہ بنیادی طور پر مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کا منظر نامہ ہے۔ اس کا تصور فرانس میں پیدا ہوا۔ 1890ء میں عورتوں کے حقوق کی سیاسی تحریک کا پتہ چلتا ہے لیکن انیسویں صدی کے پہلے نصف میں اس کی فکری بنیادیں رکھی جا چکی تھیں۔ عورتوں کی اجتماعی آواز انقلاب فرانس ۱۸۹۳ء میں اُبھری۔ میری والسٹون کرافٹ (Mary Walstone Croft) کی کتاب vindication of the rights of women نے تحریک آزادیِ نسواں میں بنیادی کردار ادا کیا۔ معاشی، سیاسی اور تعلیمی حقوق کی جدوجہد جاری رہی۔

۱۸۸۲ء میں (Married Women's Property Act) پاس ہوا' جس میں عورت کے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا اور اسے یہ اجازت ملی کہ وہ اپنی رقم جس طرح چاہے خرچ کرے۔ ناروے میں ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۰ء کی دہائیوں میں عورت کے حق وراثت کو تسلیم کرکے برابری کا درجہ دیا گیا اور ۱۸۶۴ء میں عورت کو کاروبار کرنے کا حق دیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں ناروے میں Professional Freedom Law منظور کیا گیا۔ اسے مغربی حقوق کی تاریخ میں قانونی سنگ میل کی حیثیت دی گئی ہے۔ تحریک آزادی نسواں میں ووٹ کے حق کو بنیادی حیثیت حاصل رہی، لیکن معاشرے اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سوئٹزرلینڈ میں ووٹ کا حق ۱۹۱۷ء میں دیا گیا، برطانیہ میں ووٹ کا حق ۱۹۱۸ء میں دیا گیا، اگرچہ ۱۸۸۰ء میں انہیں مقامی حکومتوں کی ملازمتوں کے لیے اہل قرار دیا گیا تھا۔ امریکہ میں ۱۹۲۰ء میں اور فرانس میں ۱۹۴۶ء میں یہ حق دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں ناروے میں انہیں تمام ملازمتوں کے لیے اہل قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں فن لینڈ کی پارلیمنٹ میں ۱۹ عورتیں بطور ارکان موجود تھیں۔ فرانسیسی اور برطانوی عورتوں نے سیاسی اور معاشرتی حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی اور عورتوں کو سیاسی جدوجہد میں شامل کرنے کی کوشیں ہوتی رہیں۔ ہسپانوی اور اطالوی عورتوں نے کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے حقوق اور معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد جاری رکھی۔ حقوق کی جدوجہد میں آزادی اور خودمختاری کی اقدار مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔

سلویا وال بی (Sylvia Wal By) کا خیال ہے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے آغاز میں تحریک نسواں کی مہم ووٹ کے حق سے آگے نکل چکی تھی۔ ان کی مہم میں طلاق کی آسانی، بہتر تعلیم و تربیت کی سہولتیں اور شادی شدہ عورت کے حق ملکیت جیسے مسائل شامل تھے' لیکن بیسویں صدی کے بڑے حصے میں وہ شہری حقوق کے لیے جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ یعنی بلا لحاظ جنس تمام بالغ اشخاص کے لیے قانونی مساوات۔ لیکن تحریک نسواں بطور ایک وسیع تحریک ۶۰ء کی دہائی میں نمودار ہوئی۔ ۶۰ء کی دہائی کئی اعتبارات سے اہم ہے۔ اس کا ایک پہلو وہ تحریکیں ہیں جن کا ظہور امریکہ میں ہوا۔ مثلاً تشدد پسند امریکی افریقیوں کی سیاہ فام قوت کی تحریک (Black Power Movement)، نوجوانوں کی تحریکیں، جیسے جمہوری معاشرے کے لیے طلبہ تحریک Students for Democratic Society، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگوں کے خلاف تحریک امن Peace Movement وغیرہ۔ تحریک آزادی نسواں نے ان سے قوت حاصل کی اور آزادی کا تقاضا کیا۔ معاشرے کے مسلمہ اصولوں پر اعتراض کیا اور ظلم و استحصال کا نشانہ بنایا۔[۲۳]

۲۳۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۵۴

جولیٹ مشیل (Juliet Mitchell) کے بقول ان تحریکوں نے تحریک آزادی نسواں کو فکری و تحریکی مواد مہیا کیا۔ عورتوں نے ان تحریکوں میں حصہ لیا تھا لیکن اس میں بھی انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں اپنی آزاد تحریک شروع کرنی چاہیے۔ بار براڈیکارڈ (Barbra Decard) ان تحریکوں میں عورتوں کی شمولیت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> Here many young women learned both the rhetoric and the organisation of protest, not surprisingly, as they became more sensitive to the black's second class status, became more aware of their own. ۲۴

اس احساس کا نتیجہ تحریک آزادی نسواں ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی تحریک کے لیے اس وجہ سے اہم ہے کہ اس وقت جہاں رویوں میں تبدیلی اور احساسات میں شدت آئی وہاں نئے معاشرتی طرز عمل کا سراغ بھی ملتا ہے۔ گل اور وِٹی (Gill & Witty) کے بقول:

> Women have worked to overcome this sexual divide. the 1960s and 70s were a period of economic expansion when women expressed their anger at apparently equal education leading to unequal jobs and career opportunities. ۲۵

امریکہ میں لبرل نسائیت اور انقلابی نسائیت کے رجحانات غالب رہے۔ امریکہ کی سب سے مؤثر تحریک نسواں Liberal National Organisation of Women ہے۔ اس کے ارکان کی تعداد ۱۷۵۰۰۰ ہے اور انقلابی نسائیت کی دو بنیادی فعال رہنما کیٹ ملیٹ (Kate Millett) اور شُلا میتھ فائیر سٹون (Shulamith Firestone) امریکی ہیں۔ برطانوی تحریک نسواں مارکسی اور اشتراکی اصولوں پر منظّم ہوئی ہے۔ ڈیوڈ بوشر (David Bouchier) کا اندازہ ہے کہ ۱۹۸۳ء میں تین سو نسوانی تنظیمیں تھیں لیکن اکثریت بائیں بازوں کی تنظیموں کے ذریعہ سرگرمیوں کو ترجیح دیتی تھی۔ ۲۶

نکی چارلس (Nickie Charless) کا خیال ہے کہ نیشنل ویمن کوآرڈینیشن کمیٹی (National Women Coordination Committee) نے اپنی قومی کانفرنس میں ۱۹۷۰۔۱۹۷۸ء مختلف اہداف کا تعین کیا اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی، جن میں مندرجہ ذیل اہم ہیں:

(i) اجرتوں کی برابری 1971ء میں

(ii) تعلیم اور ملازمت کے برابر مواقع

(iii) ۲۴ گھنٹے مفت نرسری کی سہولت ۱۹۷۵ء میں

۲۴۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۵۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۶ ۲۶۔ ایضاً، ص ۵۸

(iv) عورت کی قانونی مالیاتی آزادی

(v) ہم جنس پرست عورتوں کے بارے میں امتیازات کا خاتمہ ۱۹۸۷ء میں

(vi) عورتوں کی جسمانی اور جنسی تشدد سے آزادی

آخری مسئلہ پر مارکسی و اشتراکی اور انقلابی گروہوں میں اختلافات پیدا ہوئے۔ انقلابیوں کے ہاں تشدد اہم مسئلہ تھا جبکہ اشتراکی معاشی عوامل کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اسی لیے یہ آخری کانفرنس تھی۔ اس کے بعد کوئی کانفرنس نہ ہوسکی۔ برطانوی تحریک نسواں نے بعض اہداف حاصل کیے لیکن انقلابی تبدیلیاں لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ البتہ برطانوی معاشرے میں ملازمتوں کے سلسلے میں جنسی تقسیم کے حوالے سے نئی تنظیم (Restructuring) اس کا خیال ہے:

> This restreucturing has changed the distribution of women and men within the work force and has made it more acceptable for men to be seen pushing proms and hanging out the washing; but it has not resulted in the elimination of women's subordination and it may have contributed to the fragmentation of the working class and the undermining of its resistance to capitalist exploitation. ۲۷

۱۹۶۰ء کی دہائی حقوق نسواں کی تحریک میں ایک نیا موڑ ہے۔ یہیں سے اس تحریک نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ اب صرف حقوق کی بات نہیں مکمل آزادی کی بات شروع ہوئی اور کہا گیا کہ آزادی و خودمختاری بذات خود ایک قدر ہے جس کا حصول ضروری ہے۔

مغربی معاشروں میں اختلاطِ مردوزن پر کبھی پابندی نہیں رہی۔ عورتوں کی جداگانہ معاشرتی سرگرمیاں، حجاب، حیا اور جائز جنسی تعلقات پر اکتفا کبھی بھی مغربی معاشرت کا اہم حصہ نہیں رہیں۔ ایک طرف عیسائیت کا تصورِ عصمت تھا جس میں جنسی زندگی ایک گندگی قرار پائی اور دوسری طرف آزاد شہوت رانی کا عمل تھا جو یونانی اور رومی معاشروں کی بدولت مغربی معاشرت کا ایک حصہ تھا۔

مغربی عورت، جو آزادی کی نئی لذت سے آشنا ہوئی تھی، اس آزاد جنسی تعلق پر مائل ہوئی لیکن اس تعلق کا نتیجہ حمل تھا' جسے قائم رکھنا اس کے لیے مصیبت کا باعث تھا۔ اس لیے بھی کہ اس سے اس کی آزادی میں فرق پڑتا تھا اور اس لیے بھی کہ اس کی شخصیت کا روپ اور حسن بھی متاثر ہوتا تھا۔ مقابلے کی اس منڈی میں بہتر اور خوبصورت مال کی زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ اس لیے مرد ایک عورت سے دوسری عورت کی تلاش میں رہتا اور عورت ایک مرد سے دوسرے مرد کی آغوش میں جانے کے لیے مسلسل تگ و دو میں رہتی۔ اس وجہ سے اسقاط حمل ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ تحریک آزادی نسواں نے اسے حقوق کی جنگ میں اہم نقطہ قرار دیا۔ لیکن اسقاط حمل ایک تکلیف دہ عمل تھا جس سے گزرنا عورت کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہا۔ ۱۹۶۰ء کی

۲۷۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۶۰

دہائی اس اعتبار سے بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں جدید میڈیکل سائنس نے مانع حمل گولیاں تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ ان گولیوں کی ایجاد نے آزاد جنسی تعلق کی ایک بڑی مشکل کو دور کر دیا۔ مغرب کی نوجوان نسل کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

''۱۹۶۰ء کی دہائی تحریک نسواں کے لیے نیا پیغام لائی۔ اب محض حقوق کی بات نہ تھی، وہ تقریباً حاصل ہو چکے تھے۔ اب عورت کی آزاد حیثیت کو مستحکم کرنا اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ مغربی معاشروں میں عورت نے بچوں کی پیدائش اور ان کی پرورش کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کردیا۔ شادی اور مستقل وابستگی کا تصور مجروح ہوا۔ خاندان کا ادارہ انتشار کا شکار ہوا۔ محض ساتھی کی حیثیت سے جوڑے رہنے لگے۔ طلاقیں اور علیحدگی کے رجحانات بڑھے۔ تنہا ماؤں (single mothers) کا ایک بڑا گروہ وجود میں آیا۔ ناجائز بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہوا۔ ماں باپ کی علیحدگی سے بچوں کی نگہداشت کے مسائل پیدا ہوئے اور آہستہ آہستہ ریاست کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ ماہرین عمرانیات اسے معاشرتی تغیر (social change) کا خوب صورت عنوان دیتے رہے۔ اس طرح مغربی معاشرہ ایک منفرد معاشرہ قرار پایا اور اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ جدید سوشیالوجی کا اہم موضوع ٹھہرا۔ طوائفیں جنہیں اب sex worker کہا جاتا ہے، اور اجرت پر جنسی عمل، جس میں طوائفیں، دلال اور گاہک شامل ہیں، جسے اب sex industry کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ مغربی معاشرے کا ایک اہم پہلو ہے..... اس آزادی کا کڑوا کسیلا اور زہریلا پھل ہم جنس پرستی ہے۔ جنس کو تفریح کا مشغلہ سمجھنے کے باعث مغرب کے مردوں اور عورتوں نے ہم جنس پرستی کو زیادہ لذت کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور اس کے لیے Gay اور Lesbian جیسی اصطلاحیں اختراع کیں۔ انہوں نے اپنے حقوق کی جنگ لڑی ہے اور اب مغرب میں ایک تسلیم شدہ اقلیت کے طور پر زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ابھی امریکہ کے اینگلیکن کلیسا (Englican Church) نے ایک ہم جنس پرست پادری (Gay Priest) کو بشپ (Bishop) مقرر کیا ہے۔''[۲۸]

نسائیت پسندی نے خاندان کے ادارے کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے' کیونکہ اس کی وجہ سے عورت محدود ہوگئی ہے اور وہ صرف ماں اور گھریلو خاتون ہے۔ اس لیے اس ادارے میں بنیادی تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ عورت کی حیثیت کی بحث نے خاندان کے ادارے کو بھی معرض بحث میں لا کھڑا کیا ہے اور اس کی تبدیلیوں کے سلسلے میں کئی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اوکلے کی رائے ہے کہ خاندان کے ادارے کو ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر عورت کے لیے ماں اور خاتون خانہ کے کردار سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ کچھ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ خاندان کے ادارے کو جوں کا توں (statusquo) رہنے دیا جائے، البتہ ماں اور خاتون خانہ کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے۔ مثلاً گھریلو کام کے لیے اجرت دی جائے اور بچوں کی نگہداشت (child care) کا انتظام کیا جائے۔ بچے کی پیدائش کے لیے چھٹی مع تنخواہ (maternity leave) دی جائے اور ملازمت پر اس کا حق باقی رکھا جائے۔ اس سلسلے میں متبادل تجاویز بھی دی گئی ہیں مثلاً: سوزان براؤن ملر (Susan Brown Milar) نے ایک تجویز دی ہے جسے وہ سادہ حل قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خاوند بیوی اپنے روایتی کردار کو درمیان میں

۲۸۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۶۲

تقسیم کر دیں۔ دونوں میں سے ہر ایک آدھا دن کام کرے اور بقیہ دن بچوں کی نگہداشت کرے۔

خاندان کے فرائض میں بچوں کی نگہداشت بھی تھی۔ اب بچوں کی اجتماعی پرورش کا متبادل اصول متعارف کرایا گیا۔ جسے روایتی مشترک خاندان اور Kibbutz کی طرح کی جمعیتیں ادا کریں۔ ہنگری کے مارکسی مصنف و جدہ اور ہیلر (Vajda and Heller) یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک اجتماعی خاندان یا کمیون (commune or collective family) یہ فرائض ادا کریں گے اور تمام بالغ افراد بچوں کی پرورش کا فریضہ انجام دیں گے۔ بالغوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت یک زوجگی سے لے کر جنسی آوارگی تک موجود ہوگی، کیونکہ کمیون میں جنسی تعلقات اخلاقی قدروں کے ماتحت نہیں ہیں۔ اجتماعی خاندان کمیون سے مختلف ہے کیونکہ وہ صرف گھریلو معاملات اور بچوں کی نگہداشت سے متعلق ہے اور یہ پیداواری اکائی نہیں ہوتی۔''[۲۹]

ایلون ٹوفر (Alvin Toffer) نے ایک انوکھا متبادل پیش کیا ہے۔ اس نے پیشہ ور والدین (professional parents) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ معاون والدین (pro parents) خاندان کی حیثیت اختیار کریں گے اور ماں باپ، چچا چچی، دادا دادی اور نانا نانی کا کردار ادا کریں گے۔ یہ لوگ بچے کی پرورش کو تنخواہ دار ملازمت کی حیثیت سے اختیار کریں گے۔ اس طرح رضا کارانہ طور پر بچوں کی پرورش کا خاتمہ ہوگا اور بہت سے حیاتیاتی والدین کو خاندانی کردار سے چھٹکارا ملے گا۔ انہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو پیشہ ور لوگوں کے سپرد کرنا ہوگا۔[۳۰]

بہت سے مصنفین نے خاندان کے متبادل اداروں کا تصور پیش کیا ہے۔ اشتراکی نسائیت پسند مصنفہ جولیٹ مشیل (Juliet Milchell) نے مختلف تجربات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق اجتماعی زندگی (communal living) سے ہے جو افراد اور حالات کی مناسبت سے متعین ہوسکتی ہے۔ وہ ایسے ادارے تجویز کرتی ہے جو رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دیں اور ان میں مختلف مرد اور عورتیں مصروف خدمت رہیں۔

جیسی برنارڈ (Jessie Barnord) بھی ایسی تجاویز کی حمایت کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مستقبل کے ازواجی رشتے ایسے ہو سکتے ہیں جس میں افراد اپنے حالات اور ترجیحات کے مطابق ان کی نوعیت طے کرسکیں گے۔ مستقبل میں عورت کے کردار کے سلسلے میں دو نظریات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں:

(i) صنفی مساوات (gender equality): صنفی امتیازات کا خاتمہ اور مرد و عورت کی یکسانیت کا نفاذ، عورت کا ان ذمہ داریوں سے آزاد ہونا جو عورت ہونے کی وجہ سے اس پر مسلط ہیں۔

(ii) آزادی اختیار: خاندان کے بارے میں رویوں کا اختیار جسے رواداری کے ساتھ برداشت کیا جائے۔[۳۱]

خاندان کے بارے میں اس تصور نے مغربی طرزِ معاشرت میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ نسائیت پسندوں کے جارحانہ پروپیگنڈے اور مردوں کے شکست خوردہ رویوں کی وجہ سے مزید تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ چونکہ مغرب ربانی ہدایت سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس نے اسلام کے خلاف بھی مہم چلا رکھی ہے، اس لیے وہ اس آخری اور جامع ہدایت سے استفادہ بھی نہیں کر پا رہا۔ اسلام کے بارے میں مغرب کے عام آدمی کی دلچسپی بڑھی ہے لیکن پالیسی ساز دانشور اور ذرائع

۲۹۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۶۹ ۳۰۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۷۱

۳۱۔ عورت کی معاشرتی حیثیت ایک تاریخی جائزہ، ص ۷۲

ابلاغ کے لوگ شیطان کے پیرو ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اسلام اور عام مغربی انسان کے درمیان دھوئیں اور غبار کا ایک پردہ حائل کر دیا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف مغرب کا عام انسان بھی اسلام کے حیات بخش پیغام سے محروم ہو گیا ہے بلکہ مسلم معاشروں کے منحرف مغرب زدہ طبقات بھی اپنے الحاد میں پختہ ہو گئے ہیں۔

تحریک نسواں کے مختلف رنگ

تحریکِ نسواں کے کئی رنگ ہیں۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے' مردوں کو خلقی طور پر غیر ذمّہ دار' بدخو' تُند مزاج اور غبی دکھایا گیا۔ ایک دوسرے رنگ میں ان کی تصویر کشی یوں کی گئی کہ وہ عیاری سے عورتوں کا استحصال کرنے والے' انہیں لونڈی بنانے والے اور کسی بھی اخلاقی معیار سے عاری ایک مخلوق ہیں۔ مظلوم عورتوں کو خاندان کے 'بیگار کیمپ' سے چھٹکارا پالینا چاہیے' اور اپنی خواہش اور ضرورت پر ہی ان سے مرضی کے مطابق تعلق قائم کرنا چاہیے۔ پہلے 'مساوی حقوق' اور صنفی برابری کی بات ہوئی اور پھر 'نسائی برتری' کا فلسفہ پیش کیا گیا۔ تحریک نے اب ایک جارحانہ روش اختیار کر لی ہے' جس میں مردوں کا مقام شہد کی مکھیوں کے نکھٹو نر (drones) سے زیادہ نہیں ہے۔

> ''امریکہ کے ماہرین عضویات اور ماہرین نفسیات اب انسانوں کی ایسی نوع کی بات کرنے لگے ہیں' جو صنفی امتیازات سے بلند ہو' یا جس میں دونوں اصناف کی خصوصیات موجود ہوں۔ اس طرح باپ اور ماں کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ اولگا سلورسٹین (Olga Silverstein) ''صنفی اختلاف کے خاتمے'' کی بات کرتی ہیں' اور سوسان مولر اوکن (Sosan Moller Okin) ایک ایسے ''عادلانہ مستقبل'' کی نوید دیتی ہیں' جو ''صنف [کی آلایش] سے پاک ہوگا''۔ یہ تجویز بھی سامنے آئی ہے کہ مردوں کا کچھ اس طرح علاج کیا جائے کہ ان میں عورتوں کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ اس طرح مردوں نے نسوانیت کے جس جال میں طبقۂ اناث کو پھانس رکھا ہے' اس سے آزادی' ایک مثالی معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔''[۳۲]

1999ء میں برطانیہ کے وزیرخزانہ گورڈن براؤن (G. Brown) نے بجٹ پیش کرتے ہوئے نوید سنائی کہ یہ ''خواتین کے لیے بجٹ ہے۔'' ساری تنہا مائیں کام کرنا چاہتی ہیں' اور ریاست بھی انہیں مفید کام پر لگانا چاہتی ہے۔ بے شادی والی مائیں' سرکاری امداد وصول کرنے والا سب سے بڑا گروہ بن چکی ہیں' اس لیے انہیں روزی کمانے پر آمادہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ جاب مارکیٹ میں اسامیاں تو محدود ہیں اور امیدوار زیادہ۔ حکومتی پالیسی یہ ہے کہ تنہا ماؤں کو شادی شدہ پر' اور کام کرنے والی ماؤں کو خواتین خانہ پر ترجیح دی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کی سماجی انجینئرنگ ہے۔ اگرچہ ''قدامت پسند'' اور ''جدید لیبر'' دونوں گروہ' شادی خانہ آبادی کی اہمیت پر وعظ دیتے رہتے ہیں' لیکن عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ بقول فنانشل ٹائمز (Financial Times) حکومت کی پالیسی کے مطابق بچے کے سارے فوائد ماں ہی کے حصّے میں

---

۳۲ Melanie Philips: The sex change society Feminised Britain and the Neutered Man; the Social Market Foundation London, 1990 P: 174.175

بحوالہ عبدالقدیر سلیم، نسوانیت زدہ مغرب، ماہنامہ بحوالہ ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۳ء، ص ۶۴

جاتے ہیں' اور آج کی مائیں مردوں سے آزاد اور کل وقتی ماں کے تصور سے دُور ہٹتی جا رہی ہیں۔

مضمون نگار کہتی ہیں:

''کوئی مہذب معاشرہ یہ توقع نہیں رکھے گا کہ عورت روزی کمانے اور گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش کی دُہری ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے۔ لاکھوں نوجوان خواتین کو روزی کمانے کے لیے بازار میں بھیج کر نہ صرف مسابقت میں اضافہ کر دیا گیا ہے' بلکہ اس طرح تنخواہ/مزدوری کی شرح میں بھی کمی ہوئی ہے۔ (سرمایہ داری میں طلب و رسد کا قانون)۔ نوجوان مردوں کی کم یافتی انہیں شادی کو ملتوی کرنے (یا اس سے دست بردار ہونے) پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سے پھر ''بلا نکاح ازدواج'' اور ''ہم خانگی''، ''یک زوجی'' یا ''تنہا مادری'' کے مسائل جنم لیتے ہیں' اور پھر وہی سماجی اور اقتصادی مسائل پیدا ہوجاتے ہیں' جنہیں حل کرنے یا کم کرنے کے لیے یہ تدبیریں کی گئی تھیں۔ برطانیہ میں ''شعوری طور پر' تدریجاً'' پدریت کو تباہ کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں مردوں اور لڑکوں میں مایوسی' غیر ذمّہ دارانہ رویے اور تشدد کے رجحانات میں اضافہ ہو رہا ہے۔''[۳۳]

عورتوں کی آزادی اور مردوں کی غیر ذمہّ داری ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ خاندان کی شکست و ریخت' معاشرے کی شکست و ریخت کا پیش خیمہ ہے' اگرچہ اس کا اعتراف نہیں کیا جا رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا تعلّق بہت پیچیدہ اور نازک ہے۔ انسانی معاشرے نے ہزاروں سال کے تجربے کے بعد ایک خاندانی نظام وضع کیا ہے' جس میں باپ کا ایک کردار ہے' اور ایک کردار ماں کا۔ مرد اور عورت صنفی طور پر مختلف ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ دونوں کے حقوق مساوی ہیں' مگر یکساں نہیں۔ ان کے درمیان تقسیمِ کار عین تقاضائے فطرت ہے۔ سبھی سماجوں میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ کچھ بوجھ وہ ہیں' جو عورتیں نہیں اُٹھا سکتیں اور کچھ وہ ہیں' جن کے لیے مرد بنائے ہی نہیں گئے اور صرف عورتیں ہی انہیں اٹھا سکتی ہیں۔ مرد و زن کی کلّی مساوات کا تصور بھی اسی قدر احمقانہ ہے' جس قدر عورت کی برتری کا۔[۳۴]

بدقسمتی سے 'بے خدا' معاشروں میں توازن کم ہی نظر آتا ہے۔ کہیں تو یہ کہا جا رہا تھا کہ 'اے عورت' تیرا ہی نام کمزوری ہے۔ (شیکسپیئر)' اور 'وہ آدمی کتنا بیوقوف ہوتا ہے' جو ایک عیار عورت کا شکار ہو کر بیوی کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ (شوپنہائر) کہیں اُسے محض خادمہ اور لونڈی سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں دیا جاتا' اور حیوانوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور پھر جب پنڈولم دوسری سمت میں حرکت کرتا ہے' تو نئی آزاد عورت وجود میں آتی ہے' جو قیدِ نکاح ہی نہیں' خود کو ہر قید سے آزاد تصور کرتی ہے۔ شاید اسے معلوم نہیں کہ اس کی یہ آزادی بھی ایک عیار اور سفاک مرد کا دامِ تزویر ہے۔

مختلف تنظیموں اور افراد کی طرف سے حقوقِ نسواں کے لیے کی جانی والی نت نئی کوششوں اور اقدامات کے نتیجے میں جو اثرات اور مضمرات وہاں کے معاشروں پر مرتب ہوئے، اُس کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اِن

---

۳۳ Melanie Philips: The sex change society Feminised Britain and the Neutered Man; the Social Market Foundation London, 1990 P: 174.175

۳۴۔ ایضاً بحوالہ عبدالقدیر سلیم، نسوانیت زدہ مغرب، ماہنامہ بحوالہ ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۳ء، ص ۶۴

کوششوں اور تحاریک کو بین الاقوامی طور پر کیس ضابطے اور محور سے منسلک کیا جائے تا کہ نہ صرف اس کو منظّم کیا جا سکے بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں اور مہلک اثرات کو کنٹرول کرنے میں بھی آسانی رہے۔

خواتین کا عالمی دن: تاریخی پس منظر

تحریک حقوق نسواں کا ایک اہم سنگ میل خواتین کا عالمی دن ہے۔ اس کا تاریخ پس منظر کیا ہے اور اس کے پیچھے کیا مقاصد کام کر رہے ہیں ہم ذیل میں اس حوالے سے کچھ معروضات پیش کریں گے۔

8 مارچ 1907ء کو امریکہ کے شہر نیو یارک میں لباس سازی کی صنعت سے وابستہ سینکڑوں کارکن خواتین نے مردوں کے مساوی حقوق اور بہتر حالات کار کے لیے زبردست مظاہرہ کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ دس گھنٹے محنت کے عوض معقول تنخواہیں دی جائیں۔ ان کے اس احتجاج پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ اس واقعہ کے ایک برس بعد 8 مارچ 1908ء کو نیویارک ہی میں سوئی سازی کی صنعت سے تعلق رکھنے والی خواتین نے ووٹ کے حق اور بچوں کی جبری مشقت کے خاتمے کے لیے مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے پر بھی حکومتی مشینری نے پولیس کے ذریعے تشدد کیا۔ گھڑ سوار پولیس نے سینکڑوں خواتین کو لاٹھیوں سے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ خواتین کو بالوں سے پکڑ کر سڑک پر میلوں دور تک گھسیٹا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بہت سی خواتین کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔

اس وقت سے لے کر آج تک خواتین اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں۔ ان کی جدوجہد کو ایک صدی سے زائد کا عرصہ بیت گیا لیکن عورت جن حقوق کے لیے ماری ماری پھرتی رہی ہے وہ آج تک اس سے زیادہ محروم نظر آ رہی ہے۔

> ''عالمی سطح پر جمہوریت اور حقوق کے لیے جدوجہد کی تاریخ میں انقلاب فرانس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے بھی یہ انقلاب اہم ہے۔ 1789ء میں انقلاب فرانس کے دوران پیرس کی خواتین نے آزادی اور برابری کے مطالبات کا نعرہ لگاتے ہوئے ورسل تک مارچ کیا۔ مارچ 1857ء میں امریکہ میں خواتین نے حالات کار کی بہتری کے لیے احتجاج کیا۔ 1866ء میں ورکرز کی پہلی عالمی کانگریس میں مطالبہ کیا گیا کہ خواتین کو پروفیشنل شعبوں میں ترقی کے مواقع دیے جائیں۔ اس کانگریس میں اس روایتی رجحان کے خلاف آواز بلند کی گئی کہ عورت کا مقام صرف گھر ہے۔ 19 جولائی 1889ء میں کلارازیٹ کن (Clara Zetikin) نے دوسری عالمی کانگریس پیرس میں ماؤں اور بچوں کے تحفظات کے ساتھ ساتھ خواتین کی شمولیت کو قومی ادارے میں شمولیت کے مواقع میسر آنے چاہئیں۔ 1899ء میں نیدر لینڈ میں خواتین کا ایک بہت بڑا اجتماع منعقد ہوا۔ اس سال انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی۔ انیسویں صدی نہ صرف جنگوں کی صدی رہی بلکہ اس صدی کے آغاز ہی سے جنگ کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اس موقع پر خواتین نے جنگ کے خلاف احتجاج کیا۔ 8 مارچ 1907ء اور 8 مارچ 1908ء کو نیو یارک میں خواتین کا احتجاج قابل دید تھا۔ 1909ء میں یہ طے پایا کہ ہر سال فروری کے آخری اتوار کو خواتین کا عالمی دن منایا جائے۔ 1910ء میں کوپن ہیگن میں سوشلست انٹرنیشنل کے اجلاس میں 17 ممالک سے تعلق رکھنے والی سو خواتین نے شرکت کی، جس

میں طے پایا کہ خواتین کے عالمی دن کو پوری دنیا میں منایا جائے لیکن اس کے لیے کوئی مخصوص تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ 1911ء میں کوپن ہیگن کے اجلاس کے مطابق 19 مارچ کو آسٹریا، ڈنمارک، جرمنی، سوئٹزرلینڈ میں خواتین کا عالمی دن جوش وخروش سے منایا گیا، تقریباً دس لاکھ مردوں اور خواتین نے جلوس نکالے، جن میں خواتین کو ووٹ کا حق دینے کے مطالبے کے ساتھ ساتھ ملازمتوں میں ان کے خلاف امتیازی سلوک کی بھی مذمت کی گئی۔ایک ہفتے بعد یعنی 25 مارچ 1911ء کو نیو یارک میں ہونے والی آتشزدگی میں 140 کارکن لڑکیوں کی موت واقع ہوئی۔ یہ لڑکیاں اطالوی اور یہودی تارکین وطن تھیں۔ اس واقعہ نے امریکہ میں مزدوروں کے لیے کی جانے والی قانون سازی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ 14-1913ء کو خواتین کا عالمی دن منایا گیا لیکن اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم کے بادل گہرے ہو چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں ایک جانب جرمنی اور سلطنت عثمانیہ ترکی، مسلمانوں کی آخری خلافت تھی تو دوسری جانب باقی ممالک تھے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل دنیا میں اشتراکیت کے نظریات تیزی سے پھیل رہے تھے خصوصاً روس اور مشرقی یورپ میں کارل مارکس کے اشتراکی نظریات کو بہت تقویت ملی تھی اس زمانے میں روس میں شاہی خاندان کی حکومت تھی۔ فروری 1917ء میں جنگ عظیم اول کے اختتام سے ایک ڈیڑھ برس قبل تک روس کے 20 لاکھ افراد نے روس میں اپنے حقوق کے لیے بھرپور احتجاج کیا جس پر وہاں کے سیاست دانوں نے اعتراضات کیے کہ یہ وقت خواتین کے احتجاج کے یے موزوں نہیں لیکن احتجاج زوروں پر رہا۔ چنانچہ حکومت نے 23 فروری کو ووٹ کا حق تسلیم کر لیا۔ یہ خواتین کی بہت بڑی کامیابی تھی لیکن اس کے پس منظر میں اشتراکیوں کی قوت تھی۔ 17 اکتوبر 1917ء کو لینن کی سربراہی میں روس میں اشتراکی انقلاب آ گیا اور روس جنگ عظیم اول کے اتحادیوں سے باہر آ گیا۔''[۳۵]

انقلاب فرانس کے بعد یہ جدید دنیا کا دوسرا انقلاب تھا جو نظریاتی بنیادوں پر مزدوروں اور کسانوں کی قوت سے رونما ہوا تھا، جس نے روس میں زار شاہی سمیت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد سے لے کر 1917ء تک خواتین کے حقوق کے حوالے سے جتنی بھی بڑی تحریکیں چلیں یا جدوجہد ہوئی، ان میں بھی اشتراکی نظریات رکھنے والوں کا کردار اہم تھا۔

جنگ عظیم اول نے روس کے اکثر خاندانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سابق دور میں خواتین کی حالت کوئی اچھی نہیں تھی۔ شادی کے بعد عورت کی جائیداد اور روپیہ پیسہ، شوہر کی تحویل میں رہتا تھا۔ روسی زبان میں ایک ضرب المثل ہے، جس کے مطابق فرصت کے وقت روسی کسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا کہ وہ اپنی بیوی کو زدوکوب کرتا رہتا ہے لیکن روس کی اشتراکی حکومت کا یہ کمال تھا کہ اس نے صرف چار پانچ برس میں نہ صرف خواتین کے لیے قانونی اصلاحات کیں بلکہ ان کو مختصر عرصے میں نافذالعمل کر کے دکھادیا۔ خواتین کے لیے کام کا دورانیہ سات گھنٹے کر دیا گیا۔ خواتین کے لیے سالانہ تعطیلات، پنشن، آرام گاہوں. ہسپتالوں کا قیام، 14 برس سے کم عمر لڑکیوں سے کام لینے کی ممانعت، سولہ برس تک کی عمر کے

۳۵۔ خصوصی ایڈیشن، جنگ، نوائے وقت، ۸ مارچ ۲۰۰۷ء

دوران تربیت کے طور پر چار گھنٹے روزانہ کام لینا اور سولہ سے اٹھارہ سال تک کی لڑکیوں کے لیے چھ گھنٹے روزانہ کام کے قوانین نافذالعمل ہوئے۔ عورتوں اور ماؤں کی حفاظت کے لیے بھی قوانین بنائے گئے، جن کے تحت کیمیاوی یا دوسری خطرناک صنعتوں یا زیادہ سخت کام کرنے والے مقامات پر لڑکے لڑکیوں کے کام کی ممانعت۔ زیادہ تھکا دینے والے کاموں سے خواتین کو چھوٹ دی گئی۔ زچگی کی صورت میں تنخواہ کے ساتھ چار ماہ کی چھٹی، دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کو تین ماہ کی چھٹی، حاملہ خواتین سے زیادہ بھاری کام لینے کی ممانعت، مرضی کے بغیر تبادلے کی ممانعت، شیر خوار بچوں کی ماؤں کو ہر ساڑھے تین گھنٹے بعد دودھ پلانے کی کم از کم آدھے گھنٹے کی چھٹی۔

ان تمام قوانین کے علاوہ سوویت یونین نے خواتین کو زندگی کے تمام شعبوں میں برابری کی حیثیت دی۔ بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر خواتین کی تقرری ہوئی۔ 1926ء میں روسی خاتون ''کولن ٹے'' کو دنیا کی پہلی خاتون سفیر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ اس سال تک سوشلسٹ سوویت ری پبلک کی دیہاتی یونینوں میں ایک لاکھ عورتیں ممبر منتخب ہوئیں۔ 1926ء تک 169 کسان عورتیں آل یونین کانگریس آف سوویت کی رکن بنیں انقلاب کی دسویں سالگرہ یعنی 1927ء سے قبل ہی دس لاکھ عورتوں کو اپنے خاندان کی سرپرست ہونے کی حیثیت سے زمینوں پر کاشت کاری اور ملکیت کے حقوق ملے۔ پہلے شادی کے لیے لڑکیوں کی عمر سولہ اور لڑکوں کی عمر کم از کم اٹھارہ سال مقرر تھی۔ خواتین کے کہنے پر لڑکیوں کے لیے بھی شادی کی کم سے کم عمر 18 برس قرار دی گئی۔

انقلاب کا سلسلہ یہ ہے کہ جب عوامی خواہشات، ضروریات جو مثبت اور تعمیری ہوتی ہیں، اس کو طویل عرصے تک چند طاقتور افراد کا مختصر گروہ دبا کر رکھتا ہے تو عوامی طاقت کے ساتھ انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس انقلاب کو اس وقت تک عوامی حمایت اور طاقت حاصل رہتی ہے، جب تک وہ عوام کی مثبت حقیقی ضروریات، خواہشات کی تکمیل کرتا ہے، یوں دیکھا جائے تو روس کا اشتراکی انقلاب خواتین اور ان کے حقوق کے حوالے سے تاریخ کا اہم موڑ تھا۔ اس انقلاب میں آبادی کی آدھی اکثریت یعنی خواتین کو حقوق دیے گئے۔

جب روس میں انقلاب کے بعد خواتین کو تحفظات اور حقوق دیے جا رہے تھے تو سرمایہ دار دنیا میں ان کے خلاف عجیب وغریب پروپیگنڈہ جاری تھا کہ روس میں خواتین بھی قومی ملکیت تصور کی جائیں گی۔ سابق سوویت یونین، جو رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا اور جس میں یورپی علاقے کے علاوہ ایشیائی علاقہ بھی تھا۔ روس کے یورپی علاقے میں مرد وزن کے تعلقات میں وہی رجحانات تھے جو مغربی ملکوں میں تھے۔ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد معاشرے کی دیگر اخلاقی برائیوں کی طرح اس برائی کے خلاف بھی اقدامات کیے گئے، 1926ء تک روس میں ایک لاکھ مرد اور عورتیں ایسی تھیں جو میاں بیوی کی طرح زندگی گزار رہے تھے لیکن ان کی شادیاں رجسٹرڈ نہیں تھیں۔ یوں 1926ء میں شادی کا نیا قانون پاس کیا گیا۔

لینن نے 1920ء میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا'' آئندہ نسلوں کا خیال مجھے بہت پریشان رکھتا ہے، وہ انقلاب کا ایک جزو ہیں۔ اگر سرمایہ دار سوسائٹی کی خرابیاں انقلابی دنیا میں شروع ہوں گی، جس طرح بعض پودے اپنے آپ پیدا ہو

جاتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان برائیوں کے خلاف بروقت کارروائی ہو۔''[۳۶]

لینن کے زمانے میں پارٹی کے اندر ایک گروہ عورتوں اور مردوں کے تعلقات بغیر کسی روک ٹوک جاری رکھنے کا حامی تھا اور دوسرا گروہ روایتی پاک بازی کا حامی تھا جو مرد اور عورت کے مصافحہ تک کے خلاف تھا۔ لینن نے فحاشی کے خاتمے اور عصمت فروشی کے رجحانات کے خاتمے پر زور دیا۔ بعد ازاں اس کا خاتمہ کیا اور فاحشہ عورتوں کے لیے حکم جاری کیا کہ پارٹی کا کوئی ممبر کسی فاحشہ عورت سے تعلق رکھتا ہو تو پارٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔ یوں دیکھا جائے تو روس کا انقلاب تاریخ میں نہ صرف خواتین کے حقوق کے حوالے سے اہم ترین رہا بلکہ اس انقلاب نے خواتین کی حرمت کے لیے ان کو قانونی تحفظات فراہم کیے۔

پہلی جنگ عظیم میں کروڑوں انسانی جانوں کی ہلاکت کے بعد دنیا کو جنگوں سے نجات دلانے کے لیے لیگ آف نیشنز قائم ہوئی لیکن نو آبادیاتی دور میں بڑی قوتوں کی کش مکش اور مالی مفادات کی وجہ سے عالمی فورم سے خواتین کے حقوق کے لیے کوئی قابل ذکر اقدامات نہیں کیے گئے۔ اس طرح لیگ آف نیشنز ناکام ہوئی۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی جو 1945ء تک جاری رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر روایتی سیاسی نو آبادیاتی نظام ٹوٹنے لگا۔ اقوام متحدہ کا ادارہ قائم تو ہو گیا، جس میں انسانی حقوق کے لیے عالمی سطح پر آوازیں بلند ہوئیں۔ خواتین اور بچوں کے حقوق پر توجہ دی جانے لگی۔ چین نے آزادی کے چند برس بعد ہی 1957ء میں خواتین کے عالمی دن کو منانے کا اعلان کیا، حالانکہ اس وقت چین نے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل نہیں کی تھی۔

1977ء میں اقوام متحدہ نے قرار داد پاس کر کے خواتین کے عالمی دن کو منانے کا اعلان کیا۔ اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں بھی خواتین کے حقوق کے حوالے سے بہت کام ہو چکا تھا، البتہ یہ ضرور تھا کہ ترقی پذیر ملکوں میں خواتین کے حقوق اور جمہوری قوتوں کے حوالے سے جدوجہد جاری رہی۔ انقلاب فرانس اور روس کے اشتراکی انقلاب 1917ء کے بعد انقلاب ایران 1979ء دنیا کا ایک بڑا انقلاب ہے، جس نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ انقلاب فرانس اور اشتراکی انقلاب کی طرح اس انقلاب میں بھی آبادی کے آدھے حصے یعنی خواتین کی فلاح و بہبود اور حقوق کی طرف توجہ دی گئی لیکن یہاں مشرقی روایات کو مدنظر رکھا گیا۔ خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے حجاب اور پردے پر توجہ دی گئی لیکن جہاں تک حقوق کی بات ہے تو ایران میں عورتوں کو مکمل تحفظ حاصل ہے۔ ملازمتوں میں خواتین کا تناسب 50 فیصد ہے، جب کہ تعلیم یافتہ طبقے میں خصوصاً سکولوں کی سطح پہ اساتذہ کے مقابلے میں استانیوں کا تناسب زیادہ ہے۔ لیکن مغرب خواتین کے حقوق کے اعتبار سے مشرق کے ان معیارات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ تضاد مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

بین الاقوامی سطح پر حقوقِ نسواں کے لیے کی جانے والی کوششوں اور ان کے اثرات پر بحث کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اِس کے اثرات صرف مغربی عورتوں تک محدود نہیں رہے بلکہ مشرقی اور مسلمان عورت بھی اس کی زد میں آ چکی ہے۔ اِس تبدیلی اور چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک مسلمان عورت کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا

۳۶۔ خصوصی ایڈیشن، جنگ، نوائے وقت، ۸ مارچ ۲۰۰۷ء

جواب پانے کی کوشش ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کوششوں سے عورت کو معاشی طور پر کچھ حقوق تو حاصل ہوئے ہیں مگر ان کے نتیجے میں عورت کی اپنے مقصد حیات یعنی ایک خاندان کی تعمیر، اس میں میاں بیوی کی پیار ومحبت اور بچوں کی نگہداشت کی طرف کس قدر پیش رفت ہوئی ہے، اس سوال کا جواب ہمیں نفی میں ملتا ہے اور صورت حال یہ سامنے آتی ہے کہ ان تمام کوششوں کے باوجود خاندان کا ادارہ خطرات کا زیادہ سے زیادہ شکار ہوتا جارہا ہے اور اس کی مثال طلاقوں کی کثرت کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عورت کے حقوق کے لیے یہ ساری کوششیں غیر فطری ہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ عورت کو اسلام کے دیے ہوئے حقوق فراہم کیے جائیں اور اسلام نے اس کو جو مقام دیا ہے، دوسرے الفاظ میں اسلام نے اس کو زندگی کی گاڑی میں جس مقام پر فٹ کیا ہے، اسے وہیں پر فٹ کیا جائے تاکہ زندگی کی گاڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوسکے اور مرد وعورت دونوں اپنے بلند روحانی مقام کو پاسکیں۔

آزادیٔ نسواں کے چند نمایاں مفکرین اور ان کے افکار

حقوق نسواں کے سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ اس کے بارے میں کوئی قدم آگے بڑھانے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ جن لوگوں نے اس چیز کی بنیاد رکھی اور اس تحریک کو آگے بڑھایا، کیا وہ ان تحریکوں کی موجودہ صورت حال سے مطمئن اور بعد میں ان تحریکوں نے جو نتائج پیدا کردیے اگر وہ مفکرین ان نتائج کو دیکھتے تو کیا وہ اب بھی اپنی بات پر ڈٹے رہتے یا وہ نئی صورت حال کے لیے کوئی نیا لائحہ عمل سوچتے۔ اس سوال کا جواب بھی یہی ملتا ہے کہ اگر چہ ان مفکرین حقوق نسواں کا نظریہ پیش تو کردیا مگر اس کے اثرات کو دیکھ کر وہ اپنے موقف پر قائم نہیں رہے بلکہ ان کا موقف بدل گیا۔ اس سلسلے میں چند اہم مفکرین کے افکار کا ایک سرسری جائزہ پیش خدمت ہے۔

یورپ میں تحریکِ آزادی نسواں کا باقاعدہ آغاز فرانسیسی انقلاب کے فوراً بعد ہوا۔ فرانسیسی انقلاب کے مفکرین کے نزدیک مساواتِ مرد وزن کا کوئی تصور نہ تھا۔ ان کی پیش کردہ 'مساوات' کے نعرے آزاد اور جائیداد رکھنے والے مردوں کے سیاسی حقوق تک ہی محدود تھے۔ روسو جیسا حریت ومساوات کا علمبردار عظیم فلاسفر بھی عورتوں کو مساوی حقوق دینے کے خلاف تھا ۱۷۸۹ء میں فرانس کی انقلابی اسمبلی میں ایک رکن کانڈورسیٹ (Condorcet) نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ شہریوں کے حقوق میں عورتوں کو بھی شامل کیا جائے۔ جس کے نتیجے میں اسے باغی قرار دے کر پھانسی دے دی گئی۔ مگر فرانسیسی انقلاب نے حریتِ فکر کا جو الاؤ گرم کیا تھا، اس کی تپش جلد ہی انگلش چینل کے پار بھی محسوس کی جانے لگی۔

۱۷۹۲ء میں ایک انگریز کو تحریک آزادی نسواں کا بانی اور اس کی کتاب کو اس تحریک کے 'بائبل' ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ میری کرافٹ کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ عورتیں مردوں کے مشابہ ہیں، اس لیے انہیں یکساں تعلیم، یکساں سیاسی حقوق (ووٹ) کام کرنے کے یکساں مواقع اور ان کے لیے یکساں اخلاقی ضابطے وضع کیے جائیں۔ لنڈ برگ کے خیال میں میری کی کتاب صرف ایک سحر انگیز رومانوی لفظ 'مساوات' کے گرد ہی گھومتی تھی۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں تین کتابوں کو زیادہ شہرت ملی اور ان کی وجہ سے متاثرہ نسوانیت کو کافی حد تک پیش کرنے میں اس کے علمبرداروں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ کتابیں اور ان کی تخلیق کرنے والے یہ تھے:

۱۔ بیٹی فرائیڈن Betty Fiedan کی کتاب The Feminine Mystique (1963)

۲۔ کیٹ میلیٹ Kate Millett کی کتاب Sexual Politics (1970)

۳۔ جرمین گریر Germaine Greer کی کتاب The Female Eununch (1970ء)

ان تینوں نے اپنی کتابوں میں جن نظریات اور تصورات کا اظہار کیا بعد میں آنے والے درجنوں لکھنے والوں نے ان میں کوئی بڑا اضافہ و ترمیم نہیں کی بلکہ تشریحات تک ہی محدود رہے۔ وہ فقط ایسی مثالیں ڈھونڈتے اور پیش کرتے رہے کہ کس طرح سے مرد عورت کو دباتا ہے اور اسے امتیازی سلوک کا نشانہ بناتا ہے۔[۳۷]

فرائیڈن، میلیٹ اور گریر کے نظریات

فرائیڈن، میلیٹ اور گریر نے جو فریم ورک طے کر دیا تھا اس کی بنیادی طور پر اہم باتیں دو تھیں۔

''اول یہ کہ مرد اور عورت کے مابین حیاتیاتی ساخت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ذہنی اعتبار سے دونوں یکساں ہیں اور بعض کے مطابق جسمانی طور پر بھی کوئی فرق نہیں تھا۔.....دوم یہ کہ معاشرے میں عورت کو دوسرے درجے کے انسان کے طور پر اگر سمجھا جاتا ہے تو اس کی سب سے بنیادی وجہ مردانہ معاشرے کا ہونا ہے جسے مردوں نے جان بوجھ کر ایسا بنایا ہے کہ عورت کو جبر کے ساتھ رکھا جائے۔.....اس مدت میں جو نئے ایشوز سامنے آئے ان میں فحاشی، طلاق کے قانون، عصمت دری (جب عورت کسی مرد دوست سے ملنے جائے یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اس کا خاوند اس پر حملہ آور ہو)، خانگی تشدد، بچے کا استحصال اور نام نہاد خوبصورتی کا تصور، چرچ میں مرد کی حکمرانی اور عورت کے خلاف امتیازی رویے، جنسی طور پر ہراساں کیا جانا اور ملازمت کی جگہ پر ہراساں کیے جانے کے مختلف اور متعدد طریقے، پولیس اور مسلح افواج کے جنسی رویے اور توہین آمیز سلوک شامل ہیں۔ اس مدت میں عورتوں نے طلاق کے قوانین تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ گھریلو تشدد، جنسی تشدد اور شادی کے بعد تشدد کو اہم مسائل کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ نوجوان عورتوں کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ شادی نہ کریں اور ایک آزادانہ مستقبل کو خود استوار کریں۔''[۳۸]

صنفی مساوات کے علمبردار اقرار کرتے ہیں کہ 1980ء کے عشرے کے وسط تک بہت سے مقاصد حاصل کر لینے کے باوجود صنفی آئیڈیالوجی کے لیے سب کچھ ٹھیک نہ تھا۔ یہ آئیڈیالوجی ایک بند راستے میں جا پہنچی تھی اور اس کی وجہ ایسے جنسی رویوں پر زور دینا تھا جن میں مرد و زن کی تمیز نہ رہی تھی اور ان کا تصور قطعی طور پر خلاف فطرت ہو گیا تھا۔ جدید تحریک نسواں کے خلاف یہ زبردست ردعمل محض اس لیے ہی نہ تھا کہ عورتوں سے شدید نفرت کرنے والے مردوں نے فیصلہ کر لیا تھا:

وہ عورتوں کی جانب سے برابری اور معاشرتی انصاف کے تمام مطالبات یکسر مسترد کر دیں گے۔ اس کے خلاف اٹھنے والی بہت سی توانا اور مضبوط آوازیں عورتوں کی ہی تھیں اور وہ بھی ایسی عورتیں جو اس صدی کے دوسرے نصف میں جدید تحریک نسواں کے احیاء کے لیے کام کر رہی تھی۔ 1981ء میں تحریکِ نسواں کی سب سے بڑی اور نمایاں لیڈر جو اب

۳۷۔ محمد عطاء اللہ صدیقی تحریکِ نسواں یا تحریکِ نازن، ص۳، اسلامک ہیومن رائٹس فورم لاہور ۳۸۔ ایضاً

بڑھاپے میں داخل ہو چکی تھی، بیٹی فرائیڈن نے اس موضوع پر The second Stage کے نام سے ایک سلسلہ تحریر کیا۔ انہوں نے تحریک نسواں کی ایسی کارکنوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جنہوں نے ان کی تحریریں استعمال کر کے ماں کے کردار کو انسانی رشتوں سے کھرچ دینے کی کوشش کی تھی۔ فرائیڈن کے خیال میں ان عورتوں نے نسوانی مردانگی کو تقویت دی اور اس کوشش میں خاندان کی وقعت کو نہایت کم کر دیا گیا۔ گھریلو خاتون کے بارے میں لکھا گیا کہ ایک ایسی عورت ہے جو اپنی پشت پر بہت زیادہ بوجھ اٹھا لیتی ہے لیکن اس کا دماغ خالی ہے۔

بیٹی فرائیڈن کا اپنے نظریات سے رجوع

فرائیڈن ان نمایاں خواتین میں سے تھی جس نے 1980ء کے عشرے کے آغاز میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ جدید تحریکِ نسواں کے مقاصد اور طور طریقے گہرے شک و شبہے کی زد میں ہیں اور ان کا عورت کے لیے مثبت قرار دیا جانا ممکن نہیں ہے۔ جرمین گریر نے بھی ایک کتاب لکھی، یہ کتاب 1984ء میں Sex and Destiny کے نام سے شائع ہوئی۔ ماضی کی اس بڑی علمبردار نے محبت اور جنسیت کے بارے میں اپنے نظریات سے رجوع کر لیا اور سوزین فیلوڈی نے اس نئے رویے کو یوں بیان کیا کہ یہ علمبردار اب ماں اور باپ کی طرف سے طے شدہ شادی، عصمت و پاکیزگی، پردے کے حق میں ہے اور ایک دیہاتی پرانے فیشن کی عورت کو اپنے لیے رول ماڈل سمجھتی ہے، باورچی خانے میں قید رہتی ہے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی چادر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔

1980ء کے عشرے کے نصف اختتام تک بہت سے نئے رجحانات ابھر رہے تھے جن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جدید تحریک نسواں محض ایک بے ضرر، دیکھ بھال سے عاری اور ترقی پسند تحریک نہیں جو ترقی، انصاف اور مساوی حقوق کے لیے کام کر رہی ہے۔ ان رجحانات کی گہرائی میں جو سوچ کارفرما تھی اس کے لیے معروف اور نمایاں کارکنوں نے شواہد جمع کیے تھے جن کے مطابق بہت سے واضح حقائق یہ تھے۔[۳۹]

☆.....ملازمت پیشہ خواتین کو بہت سے نفسیاتی اور صحت سے متعلقہ مسائل کا سامنا ہے۔ بالخصوص تنہا عورتوں کے ساتھ یہ معاملہ زیادہ سنجیدہ ہے۔

☆.....عورتوں میں وضع حمل کی شرح کم ہو رہی ہے اور وہ ایک بحران میں مبتلا ہیں وہ مردوں کی طرح مضبوط نظر آنا چاہتی ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

☆.....ڈے کیئر کی جسمانی اور نفسیاتی قیمت بہت زیادہ ہے۔

☆.....طلاق لینے والی خواتین کے معیار زندگی میں نمایاں کمی آ رہی ہے۔

☆.....ایسی عورتوں کی شادی مسئلہ بن گئی جنہوں نے تیس کی دہائی میں شادی پر ملازمت کو ترجیح دی اور اب ان کے لیے مردوں کی کمی ہو گئی۔

خاندانی نظام کی تباہی اور شادی کی ضرورت کا خاتمہ تحریکِ نسواں کے بنیادی اہداف میں شامل رہا ہے۔ میرے

۳۹۔ محمد عطاء اللہ صدیقی تحریکِ نسواں یا تحریکِ نازن، ص۳، اسلامک ہیومن رائٹس فورم لاہور

وولسٹن کرافٹ سے لے کر آج تک اس تحریک کی علمبردار تمام عورتوں نے خاندان کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ کیونکہ خاندان بطور ادارے کے مرد وزن کے آزادانہ اختلاط اور جنسی بے راہ روی کے راستے میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔

1960ء کے عشرے میں امریکہ اور یورپ میں رونما ہونے والے 'جنسی انقلاب' نے تحریک نسواں کے لیے آتش گیر مادے کا کام کیا 1960ء میں جب بے ٹی فرائیڈن کی کتاب ''نسوانی راز'' (Feminine Mystique) سامنے آئی تو اس سے تحریک نسواں کا مزاج ہیجان خیز بغاوت کی صورت اختیار کر گیا۔ اس دور کو ''جدید عورت ازم'' یا تحریکِ نسواں کا دوسرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں تمام اخلاقی قدروں اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اس تحریک سے وابستہ خواتین مصنفین نے ہر موضوع پر بے حد بے باکانہ قلم درازی کی۔ ہر وہ بات جسے عورت کی زبان یا قلم سے نکلنا نسوانی حیا کے تقاضوں کے منافی سمجھا جاتا تھا، اب انہوں نے روشن خیالی کے احساس تفاخر سے مغلوب ہو کر تحریر کی جنس سے وابستہ شاید ہی کوئی رکیک خیال ہو جو ان کی شوخی تحریر کی زد میں آنے سے بچ گیا ہو۔ اس دور کی چند نامور انقلابی خواتین میں کیٹ ملٹ (Kate Millat) جرمین کریر (germain Creer) این کا ڈٹ (Ann Koedit) ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کے بے حد واہیات نام ہیں مثلاً جرمین کریر کی کتاب کا نام ''نسوانی ہیجڑے'' (Female Eunuch) ہے۔

یورپ میں یوں تو ہر دور میں ہم جنس پرست (Lesbian) عورتوں نے تحریکِ نسواں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ لیکن 1970ء کے لگ بھگ یہ عورتیں عملاً اس تحریک کے ہراول دستے پر قابض ہوئیں۔ تحریک نسواں کی قیادت پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے نئے نعرے تشکیل دیے۔ مثلاً:

"Feminism is the theory, ... Lesbianism is the practice"

ایسی تباہ کن تحریک اور مرد وزَن کی غیر فطری مساوات کے خلاف ردّعمل ایک فطری عمل ہے۔ اس تحریک کا شور و غل اور دھوم دھڑکا امریکہ میں نسبتاً زیادہ رہا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے خلاف باقاعدہ منظّم ردّعمل بھی پہلی مرتبہ امریکہ میں سامنے آیا۔ 1973/74ء میں امریکی کانگریس میں جب مساوی حقوق کی ترمیم Equal Rights Amendment. (E.R.A.) کا بل پیش کیا گیا تو اس کے خلاف ردّعمل نے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ دنیا پر پہلی مرتبہ منکشف ہوا کہ 'مساوی حقوق' کی علمبردار متحرک اقلیت کو امریکی عورتوں کی خاموش اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ E.R.A. کی مخالفت میں اٹھنے والی تحریک کی قیادت امریکی ریاست نارتھ کیرونیا سے تعلق رکھنے والی خاتون مادام شیلا فلائی (Schlafly) کر رہی تھیں۔ انہوں نے ریاست ہائے متحدہ کے طوفانی دورے کیے اور امریکی عورتوں میں یہ شعور پیدا کیا کہ ERA کے نتائج عورتوں کے حق میں نہیں ہوں گے۔

مادام شیلا فلائی جیسی خواتین کی طرف سے بظاہر عورت کی آزادی مگر درحقیقت ہر محور، پر رشتے اور پہچان سے رشتہ ناطہ توڑنے کی اس شیطانی تحریک کے خلاف آواز اٹھانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ باطل کے مقابلے میں حق کہیں نہ کہیں ضرور سر اٹھاتا ہے اور حق کی اِس آواز کے لیے مغرب اور مشرق کے حدود و قیود لازمی نہیں کیونکہ حق قدرت خداوندی کے ازلی قانون کے تحت کام کرتا ہے اس تحریک کے خلاف مادام شیلا فلائی کی یہ مزاحمت دراصل ان نقصانات سے بچنے کی ایک کوشش قرار دی جا سکتی ہے جو اس طرح کی تحریکوں اور تحریروں سے مغرب اور شمالی امریکہ کے معاشرے کو پہنچنے لگے تھے۔ آنے

والے صفحات میں ہم معاشرے پر اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ تحریک' جواب تہذیب مغرب کا لازمی جزو بن چکی ہے' اس کے عالم آشکارا اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں وہی حقوق و آزادیاں حاصل ہوں جو مرد کو حاصل ہیں۔ دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت' تجارتی و صنعتی سرگرمیوں اور دیگر تفریحی مشاغل میں خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا حق حاصل ہو۔ معاشرہ مساوات مرد وزن کے بنیادی اصول پر استوار ہو۔ بظاہر خوشنما اور دلفریب منشور اور ایجنڈے کی حامل اس تحریک کا دعویٰ ہے کہ عورت کو اس کے اصل حقوق اسی تحریک اور جدید تہذیب نے دیے ہیں۔ مگر تجزیہ کیا جائے تو اسی تحریک کے نتائج یہ ہیں کہ آج مغرب کی عورت کا دامن نسائیت کی پاکیزگی' عصمت وعفت' حقیقی احساس تحفظ' امن وسکون' احترام و وقار اور پائیدار مسرتوں سے خالی ہے۔ خواتین کی آزادی و بے باکی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ شرم و حیا اور عفت و پاکیزگی اس کے نزدیک بے معنی الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی اخلاقی ساکھ تباہی کے دہانے پر ہے اور خود صحیح الفکر مغربی مفکرین اور دانشور برملا اپنی تحریروں میں اس مادر پدر آزادی پر کڑی تنقید کر رہے ہیں۔

درحقیقت ہر شعبہ زندگی میں خواتین کو مردوں سے مسابقت کا موقع دے کر مغرب کی سرمایہ دارانہ ذہنیت نے اپنے لیے معاشی فوائد اور مادی ترقی کی راہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ایک طرف تو اس ذہنیت نے عورت کو گھر کی چار دیواری کے امن وسکون سے باہر نکال کر فیکٹریوں اور کارخانوں میں لا کھڑا کیا اور یوں افرادی قوت میں اضافے کے ذریعے بے مثال معاشی فوائد حاصل کیے تو دوسری طرف میڈیا کی دنیا میں عورت کے حسن و جمال کو اپنے لیے ''کموڈٹی'' کے طور پر استعمال کیا۔ دونوں راستوں کے ذریعے مغرب کے سرمایہ دار طبقے نے اپنی مادی ترقی کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

اخلاقی و معاشرتی تباہی جیسے سنگین مسائل سے صرف نظر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج پاکستان سمیت دیگر ممالک میں سماجی' سیاسی' معاشی ہر سطح پر خواتین کا استحصال عروج پر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

سرکاری و بین الاقوامی سرپرستی میں میڈیا جس طریقے سے خواتین کے کردار کی تذلیل اور ان کی حیثیت کو مسخ کر رہا ہے۔ اس نے خواتین کے لیے ہر سطح پر ناخوشگوار ماحول پیدا کر دیا ہے۔ اس ضمن میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی محض یہ رپورٹ ہی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ ''خواتین کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے پیچھے کمزور عدالتی نظام' کرپٹ پولیس یا مجرموں کی سرکاری و سماجی سرپرستی سے زیادہ اصل وجہ میڈیا کے ذریعے خواتین کی بے جا نمودو نمائش اور ان کو ''اشیائے تجارت'' کے طور پر پیش کیے جانے کی پالیسی ہے''۔[۴۰]

اس رپورٹ سے با آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتین کے ساتھ ہونے والے استحصال اور معاشرتی ناانصافیوں کی اہم وجہ میڈیا کی غیر اخلاقی پالیسی ہے اور اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ خواتین کے حقیقی مسائل' جن میں سب سے اہم عدم تحفظ کا احساس ہے' پسِ پشت ڈال دیے گئے۔

عورت کی شناخت کا جو جھرنا غارِ حرا سے پھوٹا' اس نے عورت کے وجود میں نئی جان ڈال دی۔ عورت کو ماں کے بلند مقام پر فائز کر کے جنت اس کے قدموں تلے رکھ دی۔ بیٹی کو رحمت بنایا۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کرنے پر ماں باپ

۴۰۔ امیمہ ظفر، حقوقِ نسواں کے نعرے اور حقیقت، روزنامہ جسارت، ۱۲/ مارچ ۲۰۰۹ء

کو جنت میں داخلے کی ضمانت دی۔عورت کوئی ایسا وجود نہیں جو پورے نظام تمدن و معاشرہ سے الگ ہو اور اس کو الگ ایک مسئلہ قرار دے کر اب بحثیں کی جائیں' سمینار و ورکشاپ کیے جائیں۔ وہ زندگی کے ہر مسئلے سے تعلق رکھتی ہے اور اسی وجہ سے بے شمار مسائل اور بحثیں اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔

عورت' جو نصف انسانیت ہے' اسلام نے اسے سر بلند کیا' اس کے حقوق نہ صرف متعین کیے بلکہ دلوائے' اسے وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا اور رائے کی آزادی دی' اسے عزت و ناموس اور تقدس کے مقام پر فائز کیا۔ انسانیت کے خالق نے مرد اور عورت کے دائرہ عمل کو مختلف بنایا ہے۔ ایک سے نوع انسانی کی حفاظت اور تسلسل کا کام لیا جاتا ہے.....تو دوسرے سے ارتقاء تمدن کا.....اور یہ دونوں مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ دونوں نوع انسانی کی تہذیب کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اسلام انسانیت کے وقار کا پورا پورا تحفظ چاہتا ہے۔عورت کا احترام سنتِ رسولؐ ہے۔ تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو سربلندی دی۔ لہٰذا عورت کو اپنی تلاش کا سفر مکمل کر لینا چاہیے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی تحریک برائے حقوق نسواں کے اثرات' جو پوری دنیا میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں' یہ حقیقت کھول دینے کے لیے کافی ہیں کہ یہ تحریک خواتین کو ان کا حقیقی معاشرتی مقام و مرتبہ دینے میں نہ صرف یہ کہ ناکام ہے بلکہ اس نے آج کی عورت سے اس کی اصل حیثیت چھین کر اسے بیچ چوراہے میں لا کھڑا کیا ہے۔ پاکستان سمیت تمام تر اسلامی حکومتوں اور دیگر معاشرتی طبقات کو اس حقیقت کا ادراک کر لینا چاہیے کہ عورت کے اصل حقوق' شخصی آزادی' حیثیت و مرتبے اور عفت و عصمت کا حقیقی محافظ مغربی نظام نہیں بلکہ وہ اسلامی نظام ہے جس نے چودہ (۱۴) سو سال قبل بھی عورت کا دامن حقیقی احساس تحفظ' امن و سکون اور دائمی راحتوں سے بھر دیا تھا اور آج بھی یہی نظام عورت کو اس کا اصل مرتبہ اور حقوق دینے کی مکمل اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ حقوق نسواں کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات میں مغربی ایجنڈے کو مقدم رکھنے کے بجائے اسلامی اقدار و روایات سرفہرست رکھ کر کیے جائیں۔ سب سے پہلے قدم کے طور پر میڈیا کے ذریعے خواتین کے استحصال کی بیخ کنی ہو۔ تعلیم و صحت' وراثت اور حق ملکیت جیسے دیگر حقوق جو اسلامی شریعت نے عورت کو عطا کیے فی الواقع عورت کو یہ حقوق دے کر اس کی اہمیت کا احترام کیا جائے۔ محض اسی صورت میں خواتین کے ساتھ ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں' زیادتیوں' سماجی تعصّبات اور مشکلات کا حل ممکن ہے۔

مسلمان عورت: استعماری ایجنڈا اور ہمارا عزم

مسلمان خواتین کی واضح اکثریت اب ببانگ دہل یہ اعلان کرتی ہے کہ جن تہذیبوں نے بھی مرد اور عورت کے درمیان فطری تقسیم کار کے خلاف اقدامات اٹھائے ہیں وہ روئے زمین سے نیست و نابود ہوگئی ہیں۔ رومن اور یونانی تہذیبیں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں عورت اور مرد ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں معاونت اور رفاقت کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ دو مدمقابل قوتیں نہیں بلکہ زندگی کی گاڑی کے دو یکساں پہیے ہیں، جو کہ حقوق، اجر و ثواب اور عذاب و پاداش میں بالکل مساوی اور یکساں، اور فرائض میں جداگانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں عورت کا کردار بحیثیت ماں اور بیوی کے اتنا ہی اہم ہے جتنا ایک ملک کے لیے حکمران، فوج

اور قانون کا ہوتا ہے۔عورت کی ممتا اور بیوی کے رول کو غیر اہم اور فرسودہ اور اسے عورت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھنے کا تصور پوری تہذیب کو ملیا میٹ کرنے کے مترادف ہے۔فطرت نے عورت کے حصے میں انسان کی تخلیق وتعمیر کی جوگراں بار ذمہ داری ڈالی ہے،اس میں اس کی فطرت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ محبت اور حفاظت سے کسی قیمتی شے اور قیمتی فریضے کی ادائیگی میں مصروف ہستی کی طرح رکھی جائے اور اسے دنیا کے جھمیلوں اور جھنجھٹوں سے بے نیاز خلوت عطا کی جائے،تبھی روئے زمین پر وہ مہذب اور متمدن نسل پروان چڑھ سکے گی جس کو گھر کی خوبصورت دنیا میں محبت ملی ہوگی وہ دنیا کو وہی محبت اور شفقت لوٹا سکے گی۔ورنہ آج کی دنیا اسی لیے فساد سے بھر گئی ہے کہ عورت نے اپنا بنیادی فریضہ غیر اہم اور فرسودہ سمجھ کر ترک دیا ہے۔یا اس پر اس نظریے کو مسلط کر دیا گیا ہے اور اس سے فرار کی راہ اختیار کرنے کو ہی عورت اپنی ترقی سمجھ بیٹھی ہے۔اور گھر جو کہ دنیا کی بنیادی اکائی ہے وہ ممتا اور گھر ہستن سے خالی ہو کر بازار کے سپرد ہو گیا ہے اور خود بھی ایک سرائے اور ہوٹل میں تبدیل ہو کر محبت اور شفقت سے خالی ہو گیا ہے۔اس لیے ہمیں واپس شادی، خاندان اور ممتا کے اداروں کی بحالی کے لیے سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔

اس ضمن میں دوسرا بنیادی حق عورت کے تحفظ اور وقار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ عائد کیا ہے کہ وہ مخلوط معاشرے کی ترویج کے بجائے مرد وعورت کے اپنی اپنی فطرت کے مطابق دائرہ کار میں کام کرنے کو ترجیح دیں۔اس کے بعد جب بھی ضروری ہو وہ ایک باوقار لباس میں (جسے اسلامی معاشرے میں حجاب کے نام سے جانا جاتا ہے) گھر سے باہر کے امور سرانجام دے سکتی ہے۔اور اسے قرآن کریم میں عورتوں کے لیے فرض قرار دیا گیا ہے، تاکہ وہ ستائی نہ جاسکیں اور محفوظ اور باوقار رہیں۔

پوری اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دور نبویؐ سے لے کر آج کی جدید دنیا تک حجاب مسلمان عورت کا بنیادی فریضہ رہا ہے۔جس کو وہ کسی شوق، فیشن، جبر، پابندی، مردوں کے حکم، معاشرے کے رواج کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم اور قرآن کے عائد کیے ہوئے فرض اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نافذ کیے گئے قانون کی وجہ سے کرتی ہے اور اسے اپنے لیے وجہ افتخار سمجھتی ہے۔لیکن استحصالی قوتیں مسلمان عورت کے اس بنیادی حق کو مذہبی شعار اور سیکولرازم کے خلاف مشتعل کرنے والا نشان بنا کر دہشت گردی کی علامت کے طور پر مشہور کر رہی ہیں۔خصوصاً نقاب والی عورت کو دہشت گرد اور فرسودہ اقدار والی عورت کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔[۴۱]

جس کو مسلم معاشرے کبھی بھی قبول نہ کریں گے۔خواہ اسلام دشمن طاقتوں کے لیے کتنی بھی خوف کی علامت کیوں نہ ہوں۔ہمیں بھی aging problem اور بوڑھے پنشنروں کے بوجھ سے لدی سوسائٹی کے خوف سے خاندانی نظام کو مضبوطی اور افزائش نسل کی بڑھوتری کے اقوام مغرب کے فلسفے سے سبق اور عبرت حاصل کرنی چاہیے اور فطرت سے بغاوت کی روش ترک کر کے صحیح اسلامی فلاحی معاشرے کی داغ بیل ڈالنی چاہیے۔جس میں عورت کا ایک ایسا غالب کردار ہے جس کی عملی مثالیں خانوادہ نبوت کی پردہ نشینوں نے اس طور پر پیش کی ہیں کہ زمانہ لاکھ اسے نظر انداز کرے وہ چھپائے نہیں چھپتیں۔

۴۱۔ دیکھئے نیوز ویک کا شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۵ء جس کے ٹائٹل پر نقاب والی مسلمان عورت کی تصویر ہے۔

چاہے وہ حضرت خدیجہؓ ہوں جنہوں نے انسانوں میں پہلے انسان کے طور پر نبوت کی گواہی دی۔ یا حضرت عائشہؓ جن کے فیصلوں پر آج کے قانون دان حضرات فیصلے کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے ایک تہائی دین کے علم سے مسلمان بہرہ ور ہوئے۔ یا حضرت فاطمہؓ جو کہ خاندان اور ممتا کے اداروں کے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا حضرت زینبؓ جن کے خطبوں نے حیدر کرارؓ کی یاد امت کے دلوں میں تازہ کی، اور جن کی شجاعت اور روایت نے واقعہ کربلا کو رہتی دنیا تک حق وصداقت کا علم بلند کرنے اور یزیدی قوتوں کے سامنے نہ جھکنے کا ولولہ انگیز سبق دیا۔

میں یہاں پر یہ بات بھی واضح کرنا چاہتی ہوں کہ اسلام مکالمے، رواداری، امن وسلامتی اور محبت واخوت کا دین ہے۔ مسلمان عورت انہی نظریات کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ وہ آج بھی دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے اور ''جیواور جینے دو'' کے اصولوں پر اس زمین کو محبت وسلامتی کی آغوش میں دینے کے لیے سرگرداں ہے۔ مگر آج اس کے لیے حجاب کی پابندی، اس کے خاندان میں بنیادی کردار اور مخلوط معاشرے کی تباہ کاریوں سے بچ کر محفوظ اور محبت بھری پناہ گاہوں میں رہنے کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی عورت کی اہمیت ہے جو مرد کی طرح سوچے، مرد کی طرح جیئے اور حتیٰ کہ مرد کی طرح لباس پہنے۔

شرق وغرب میں بیدا رہونے والی نئی مسلمان عورت تمام تر دہشت گردی (چاہے وہ انفرادی ہو یا ریاستی دہشت گردی) سے سرعام بے زاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کا عزم کررہی ہے کہ اپنی روایات اور اپنی اقدار پر کسی کا زبردستی تسلط تسلیم نہ کرے گی۔ چاہے اس کے لیے اسے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے اور ہم اقوام عالم اور ان کے اداروں سے بھی یہ توقع رکھتی ہیں کہ زبردستی اپنی تہذیب اور اقدار کو تھوپنے کی بجائے وہ مکالمے، بحث ومباحثے اور احترام ورواداری کے اعلیٰ انسانی اصولوں کو اپنائیں تاکہ ہم مہذب معاشرے تشکیل دے کر مہذب اقوام سے اس روئے زمین کو مہذب اور امن وآشتی کی جگہ بنا سکیں۔

مسلمان عورت اور عہد حاضر کے تقاضے

آج مغربی عورت آزادی کے نام پر جس بدترین انسانی استحصال کا شکار ہے مساوات کے نام پر جن بھاری بوجھوں تلے دب چکی ہے اور ترقی کی آڑ میں جس طوفان میں گھر چکی ہے وہ ہمارے مغرب پرست طبقہ کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

کئی عشرے قبل امریکہ کے ایک مفکر رابرٹ ماسکن نے لکھا:

> ''ہماری نئی نسل تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہے۔ یہ آزادی سے شراب پیتی ہے، جوا کھیلتی ہے اور باہم روابط قائم کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورا ملک شدید اخلاقی بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ آپ کو جابجا منشیات کے عادی نوجوان' کنواری مائیں اور حرامی بچے غول کے غول نظر آئیں گے۔ امریکہ کی بے شمار لڑکیاں حاملہ ہونے کی وجہ سے تعلیم چھوڑ جاتی ہیں۔ سکولوں میں لڑکیوں کی تعداد 85 فیصد تک جا پہنچی ہے۔ خواتین کی اس بے راہ روی کی وجہ سے امریکہ میں طلاقوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے۔''[۴۲]

۴۲۔ عاصم نعیم امیر اللہ، مسلمان عورت اور عہد حاضر کے تقاضے، ماہنامہ دعوۃ، جنوری ۲۰۰۶، ص ۶۰

موجودہ مغربی معاشروں میں عورت ترقی و مساوات کے نعروں میں بہک کر توہین و تذلیل کے ایسے مقام تک آ گئی ہے جہاں سے اس کا پلٹنا بھی ممکن نہیں رہا۔ آج مغرب میں عائلی نظام بالکل تباہ و برباد ہو چکا ہے اور اس صورتحال نے وہاں کے مفکرین و دانشوروں کو اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔

مگر اس کے باوجود اس تہذیب کے اثرات بد ہمارے معاشروں میں خطرناک حد تک سرایت کر گئے ہیں۔ ہمارے مغرب زدہ دانشور اس معاملے میں مغرب کی نقالی ہی کو عورت کی ترقی سمجھتے ہیں۔ جدید ذرائع ابلاغ اور فنون ہائے کثیفہ ان کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔ مسلمان عورت ایک نہایت نازک دوراہے پر کھڑی ہے۔ آخر وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر وہ عہد جدید کے نت نئے بدلتے تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو سکے اور اس کی فطری حیثیت بھی برقرار رہے، فساد قلب و نظر اور بگاڑ سے پُر معاشرہ میں مسلمان عورت کیا کرے؟

اگر عورتیں اسلام کے نظام زندگی کو خوب اچھی طرح سمجھ کر ایمان لائیں اور اسے اجتماعی طور پر غالب کرنے کے پروگرام میں مردوں کی شریک کار بننا چاہیں تو ان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ نئی نسلوں کی تعمیر جدید پر پوری توجہ صرف کرنے کا فیصلہ کریں پھر ہر طرف سے اپنی توجہات سمیٹ کر پوری طرح اس اسکیم پر مرتکز کر دیں تا کہ ان کی دی ہوئی تربیت سے خدا پر ایمان رکھنے والی' قرآن کو سمجھنے والی' دنیا کے بجائے آخرت پر نگاہیں جمانے والی' نبیؐ اور آپ کے صحابہ کے نمونے کا اخلاق رکھنے والی اور زندگی کے ہر میدان میں خدا کی رضا کو مقصود بنا کر اپنا لوہا منوانے والی نسل اسلامی معاشرے کی زینت بن سکے۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری[۴۳]

''فاطمۃ الزہراؓ کے نقش قدم پر چل اور اس زمانے کی نظروں سے چھپ جا، تا کہ تیری گود میں بھی حضرت حسینؓ جیسی صفات والی اولاد ہو۔''

۴۳۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال، ارمغانِ حجاز، باب ۱۲، دخترانِ ملت، ص ۱۹۲۲